المعتزلة بين القديم والحديث

ماضی اور حال کے آئینہ میں

تالیف ڈاکٹر طارق عبدالحلیم

ڈاکٹر محمد عبدہ

ترجمہ
عبدالعظیم حسن زئی

نظرثانی
عبدالحنان سامرودی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فضيلة الشيخ محمد عبده حفظہ اللہ کا تعارف

فضيلة الشيخ محمد عبده حفظہ اللہ

الشیخ محمد عبدہ حفظہ اللہ ۱۹۶۵ میں کلیۃ حقوق سے دمشق سے فارغ ہوا اس کے بعد موصوف نے ۲۰۰۳ء میں جامعہ جلاسجو سے تاریخ اسلامی میں ڈاکٹریٹ کیا۔اور ۴ سال تک وسط ایشا، یورپ اور امریکا میں دعوتی خدمات سرانجام دیں،اور کئی سال تک مجلة البيان السنية میں رئیس التحریر کے طور پر کام کیا اور قاہرہ سے شائع ہونے والے رسالے المنار کے مشیر رہے۔آپکی فرق اور تاریخ میں بڑی بلند و بالا تعلیفات ہیں۔اور فکر الاسلامی پر بہت سے اچھے مقالات ہیں۔

الشیخ محمد عبدہ حفظہ اللہ علماء میں دعوت کے میدان میں ایک نابغہ روزگار ہیں۔امت مسلمہ کی اصلاح اور اسلام معاشرہ میں انکا بنیادی کردار ہے۔

الشیخ موصوف کی بڑھتی ہوئی شہرت سے خوفزدہ ہوکر آپ کے خلاف آپکے مخالفین نے داخل اور خارج سے حملے کئے تاکہ اسلام پر کاری ضرب لگائی جائے۔

یہ کوئی تاریخ اوراق گردانی نہیں بلکہ اس میں دورس اور عبرتیں ہیں جو کہ حاضر اور مستقبل میں ایک راہنما ہیں۔

تعلیفات

① مقدمة في اختلاف المسلمين وتفرقهم

② داراسات فی الفرق المعتزلة بين القديم والحديث

③ الصوفية نشأتهاوتطورها

④ حركة محمد النفس الزكية

⑤ أيعيد التاريخ نفسه(دراسةلواقع المسلمين قبل صلاح الدين الأيوبى)

⑥ البداوةوالحضارة(تعليق على مقدمة ابن خلدون)

⑦ التعصب الأوربى أم التعصب الاسلامى

⑧ خواطر فى الدعوة

⑨ تأملات فى الفكر والدعوة

⑩ رسائل من السجن لابن تيمية رحمہ اللہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مصنف کا تعارف

فضیلۃ الشیخ ڈاکٹر طارق عبدالحلیم حفظہ اللہ

پچھلے ۳۰ سالوں سے ڈاکٹر طارق عبدالحلیم حفظہ اللہ دعوت کے سلسلے میں وسط ایشیا، یورپ، اور امریکہ میں کافی سرگرم ہیں۔ اس دوران انہوں نے اسلامی عقائد، فِرَق، اور اصول الفقہ کے موضوع پر کئی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ان کی کتب ومضامین علماء کے حلقوں میں بہت مقبول رہے ہیں۔ ان کی مشہور کتاب ''الجواب المفید فی حکم جاھل فی التوحید '' جو کہ ۱۹۷۸ء میں شائع ہوئی، اور حال میں اسے سعودی عرب میں ''مجموعہ عقیدۃ الموحّدین'' میں شامل کر کے ۱۹۹۱ء/ ۱۴۱۱ھ میں شائع کیا گیا جس کی تقدیم شیخ عبدالعزیز بن باز حفظہ اللہ نے فرمائی۔ ڈاکٹر طارق عبدالحلیم حفظہ اللہ کے بیشتر مضامین وسط ایشیا کے مؤقر رسالوں میں اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ جبکہ عصر حاضر کے مسائل پر بھی ان کے مضامین اور ریسرچ پیپرز قابل قدر ہیں جنہوں نے مسلم امت کے اُفکار کو صحیح ڈھال مہیا کی ہے۔

المعتزلہ ماضی اور حال کیآ ئینہ میں

یہ عربی کتاب المعتزلہ کا جو ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ اب اس کا اردو میں ترجمہ شائع کیا جا رہا ہے گمراہ کن فرقوں کی شناخت کے سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ بہت جلد اس سلسلے کی دوسری تصانیف کو بھی ترجمہ کر کے شائع کیا جائے گا۔

عصر حاضر کی یہ ایک انتہائی ضرورت ہے کہ مسلمان نوجوانوں کو جو کہ اسلامی شریعت اور فقہ میں صرف تباہ کن اور گمراہ فرقوں کے ذریعے سے متعارف ہوتے ہیں جیسا کہ جعلی سلفی، صوفی، شیعہ، مرجئہ، خوارج اور معتزلہ وغیرہ انہیں اس بات کا احساس دلایا جائے کہ ان فرقوں کے ساتھ شامل ہو کر وہ کتنی گمراہی میں آگے بڑھ رہے ہیں؟

اس دور کے اسلامی معاشرے میں غلط اور باطل کو صحیح اور حق بنا کر پیش کیا جا رہا ہے اور حق کو عوام کی نظروں سے چھپا کر گمراہی کی طرف دھکیلا جا رہا ہے، یہ کتاب فکرمند مسلمانوں کے لئے ایک اہم مطالعہ ہے۔

تعلیفات

① ''الجواب المفید فی حکم جاهل فی التوحید''، مطبعة المدنی ، القاهرة،١٩٧٨ ء، نشرته مكتبة الطرفين بالطائف ١٩٩١ ء ضمن مجموعة ''عقائد الموحدين'' تقديم الشيخ بن باز رحمة الله عليه

② ''حقيقة الايمان ''،طبعات متعددة،مطبعة المدنی،القاهرة،١٩٧٩ ء

③ ''مقدمة في اختلاف المسلمين وتفرقهم'' طارق عبدالحليم ومحمد العبدة، طبعات متعددة ، دارالأرقم الكويتية، طبعة أولى ١٩٨٦ ء

④ ''الصوفية : نشأتهاوتطورها'' طارق عبدالحليم ومحمد العبدة ،طبعات متعددة ، دارالأرقم ، لندن ، طبعة أولى ١٩٨٦ ء

⑤ ''فتنة أدعيأ السلفية وانحرافاتهم '' طارق عبدالحليم ، دار الأرقم ، تورنتو، طبعة أولى ٢٠٠٣ ء مركز دار الأرقم الاسلامی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ موجودہ دور میں یہ ایک عقل وفکر کا ایسا فرقہ یا گروہ وجود میں آچکا ہے جن کے عقلی دلائل وعلمی فکر بہت ہی متاثر کن ہے حالانکہ یہ جو لوگ جس فرقہ سے متاثر ہورہے ہیں یہ کوئی نیا فرقہ نہیں ہے بلکہ یہ اُن افکار ونظریات کا دعویدار ہے جو پہلے بھی بارہا سامنے آتے رہے ہیں ان نظریات پر مشتمل کتب بعض لپیٹی جاچکی ہیں اور ان پر عمل کرنے والے گذر گئے۔ یہ خیالات ونظریات اسلام میں باہر سے داخل کیے گئے ہیں صرف ان میں طریقہ، اسلام کا نقل کیا گیا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ نظریات اسلام کے اصول وفروع کو منہدم کردینے والے ہیں۔

اس موضوع پر تفصیل سے لکھنے سے قبل ہم چاہتے ہیں کہ ان لوگوں کے بارے میں کچھ معلومات فراہم کردیں تاکہ حق کی صحیح صورت سامنے آسکے اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ کسی بھی موضوع پر اس طور سے لکھنا کہ قاری اور مصنف دونوں کو بات مکمل طور پر سمجھ میں آجائے اس کے لیے ضروری ہے کہ اس موضوع سے متعلق تمام مباحث قلم بند کردیئے جائیں کہ کوئی بات مخفی نہ رہے اور ہر ذی عقل اس مسئلے کی حقیقت سے واقف ہوجائے اور وہ غلط فہمیاں دور ہوجائیں جو کسی بھی صاحب عقل سلیم کو الجھن میں ڈالنے کا سبب بنتی ہوں یہ بیان اور وضاحت اس طرح سے ہو کہ حق تک رسائی کی مکمل رہنمائی کرے۔

گذشتہ مذاہب کے بارے میں بتانا اور ان کے باطل نظریات کی تردید کرنا یہ دراصل قرآن مجید کا طریقہ رہا ہے اور ہم نے اسی سے اخذ کیا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید نے قوم لوط علیہ السلام، قوم صالح علیہ السلام، قوم ہود علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے مختلف ادوار اور ان کی حرکتوں کا ذکر کیا ہے ان کے سامنے پیش کیے جانے والے دلائل اور ان کی طرف سے ردّ کرنے کیلئے حیلے بہانے، تاویلیں اور تحریفات من وعن تفصیل سے بیان کی ہیں۔ ان تفصیلات کے بیان کا مقصد یہ ہے کہ ان خرابیوں سے لوگوں کو خبردار کردیا جائے تاکہ وہ ان نظریات یا اعمال سے اجتناب کریں اگر بیان یہی کا مقصد ہو جیسا کہ قرآن کا مقصد یہی ہے تو یہ سب سے بہتر کام ہے اور اگر کوئی شخص کسی اور مقصد کے لئے سابقہ مذاہب کی خرابیاں بیان کرتا ہے تو یہ غلط نظریات کی تشہیر واشاعت کے علاوہ کچھ نہیں یہ صرف فساد کا سبب بنے گا فائدہ کچھ بھی نہیں ہوگا سوائے اس کے کہ پڑھنے والوں کی عقل وفہم کو بگاڑا جائے اور ان کے دلوں پر مزید تالے ڈال دیئے جائیں۔

یہ تو پہلی بات تھی، دوسری بات یہ ہے: کہ انسانوں کے مرنے سے افکار ونظریات نہیں مرتے اس لیے کہ فکر تو عقلی نتیجہ ہے جو انسان کے مادی جسم کے بجائے اس کی روح سے برآمد ہوتا ہے لہٰذا جسم کے مرنے کے بعد بھی نظریہ اور نتیجہ زندہ رہتا ہے۔ اور جب تک اس نظریہ کی اشاعت کی جائے گی جتنی تشہیر کی جائے گی یہ نظریہ پھیلتا جائے گا چاہے نظریہ حق ہو یا باطل۔ اس کی مثال تو جراثومہ کی سی ہے جو ایک سے دوسرے میں منتقل ہوتا جاتا ہے انسانی تاریخ کا مطالعہ اس بات کا ثبوت ہے۔

تیسری بات: جب ہم تاریخ انسانی پر غور کرتے ہیں تو ہمیں انسانی افکار ونظریات میں عجیب قسم کی مشابہت ومماثلت نظر آتی ہے ایسا لگتا ہے کہ زمانہ گذرنے اور علاقے مختلف ہونے کے باوجود تمام انسانوں کی فکر میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ نظریات انہوں نے ایک دوسرے سے لیے ہیں۔ یہ حقیقت بھی ہے کہ ان گروہوں اور فرقوں نے ایک دوسرے سے افکار لیے ہیں ایسا ہوتا بھی ہے اس لیے کہ ہر عقل وفرد کی یہی صلاحیت ہے جو اللہ نے انسانوں کو بخشی ہے انسانوں کی اجتماعی ذہنی کیفیت اکثر اصولوں میں باہم مشابہت رکھتی ہے۔ اسی لیے ہم قارئین کے سامنے بطورِ حُجّت معتزلہ سے پہلے گذرے ہوئے فرقوں کے عمومی اصولوں سے متعلق بحث کریں گے اور معتزلہ کے وہ افکار بھی پیش کریں گے جن سے کچھ بدعتی بھی متاثر ہوئے ہیں۔ معتزلہ کے نظریات کے بارے میں بحث کرتے ہوئے ہم علم کلام کے عمومی اصولوں اور مسائل کا بھی تذکرہ کریں گے اس لیے کہ علم کلام کی ترویج وترقی میں معتزلہ کا اہم ترین کردار ہے اور اگر یہ قابل فخر کام ہے تو معتزلہ قابل تعریف کہلائیں گے کہ انہوں نے ہی علم کلام کو ایجاد کیا ہے۔ ہم علم کلام کی کوتاہیوں کی بھی نشان دہی کریں گے۔ مگر ہماری بات صرف علم کلام کے اصولوں اور معتزلہ کے افکار تک محدود رہے گی اُن (بے فائدہ) تفصیلات میں ہم نہیں جائیں گے۔ جو ہمارے لئے اور پڑھنے والے کے لئے بے فائدہ ہیں۔

سب سے پہلے ''باب اول'' میں ہم علم الکلام کی ابتداء اور اس کے ارتقاء سے بحث کریں گے آیا اس علم میں اتنی قوت یا صلاحیت ہے کہ کچھ مسلمانوں نے اس کو ''علم توحید'' سمجھ رکھا ہے؟ اور وہ کہتے ہیں کہ اسی پر تمام خاص وعام مسلمانوں کو متحد ہونا چاہیئے معتزلہ نے اس علم کو اس اہمیت تک پہنچادیا کہ بعد میں اشاعرہ بھی اس سے متاثر ہوئے۔ اور توحید کے مفہوم میں شکوک وشبہات کا داخل ہونا بھی اسی علم کا نتیجہ ہے۔ جس نے لوگوں کو علمی انحطاط، تقلید اور لفظی مباحثہ میں مبتلا کردیا۔

اس علم کے بارے میں اہل السنۃ کی رائے اور متکلمین کے اقوال بھی ہم قلمبند کریں گے۔

دوسرے باب میں ہم معتزلہ متمثلہ کے عقائد اور ان کے ائمہ کے مقرر کردہ پانچ اصول بیان کریں گے اور ان کے مذاہب کے وہ تمام مسائل ذکر کریں گے جو فطرت سے متصادم اور دلائل ونظریات میں ہدایت ربانی سے بہت دور ہیں۔ ہم ان مسائل کے بارے میں شرعی دلائل بھی تحریر کریں گے تاکہ حق واضح ہو سکے۔

معتزلہ کے موقف کو سمجھنے کیلئے ہم تین طرح کے امور سے بحث کریں گے اور یہی تین امور زیادہ اہم ہیں اس لیے کہ یہ معتزلہ کے اُس منہج پر دلالت کرتی ہیں جو انہوں نے احکام کے صحتِ ثبوت اور عقائد اور شرائع کی فہم میں اپنایا، وہ امور یہ ہیں:

❶ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں معتزلہ کا موقف

❷ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں موقف

❸ تاویل کے بارے میں معتزلہ کا موقف

اور تیسرے باب میں ہم معتزلہ کے افکار ونظریات کا سیاسی رنگ اور ان کے افکار میں تغیر وتبدل جو کہ اسلامی تاریخ کے ساتھ ساتھ ان میں آتا رہا اس کے بارے میں بات کریں گے کہ کس طرح معتزلہ باقاعدہ ایک مستقل فرقہ بنا جب سے واصل بن عطاء نے اس کی بنیاد رکھی اور مامون عباسی کے دور میں اسے سیاسی غلبہ وطاقت حاصل ہوئی۔ پھر متوکل کے دور میں یہ فرقہ انحطاط کا شکار ہوا۔ جبکہ بویہیین رافضہ کے دور میں اسے پھر عروج ملا اور ''اعتزال'' باقاعدہ ایک مذہب کی شکل اختیار کر گیا جو اسی معتزلہ کے نام سے پہچانا جانے لگا جو دلی طور پر تو رافضی تھا مگر بظاہر اشاعرہ عقائد کو اپنائے ہوئے تھا۔

(فضیلۃ الشیخ ڈاکٹر طارق عبدالحلیم حفظہ اللہ)

معتزلہ کے بارے میں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی رائے

ان لوگوں نے پہلے ایک رائے قائم کی اور پھر قرآنی آیات کو ان پر چسپاں کیا جبکہ ایسا کام اسلاف یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین رحمہم اللہ میں سے کسی نے نہیں کیا نہ ہی ائمہ مسلمین میں سے کسی نے کیا ہے نہ سلف کی تفاسیر یا آراء میں (ان کی تائید میں) کچھ ہے۔ جہاں تک ان معتزلہ کی باطل تفاسیر کی بات ہے تو ان کا بطلان کئی طرح سے ہوسکتا ہے، علمی لحاظ سے بھی ان کے اقوال ردّ ہو سکتے ہیں اور ان کی تفاسیر کی علمی غلطیوں کی نشان دہی کر کے بھی ان کا ردّ ہوسکتا ہے، انہی کے اقوال کو ان کے اعتراضات کا جواب بنایا جاسکتا ہے۔ (مقدمہ فی اصول تفسیر ابن تیمیہ رحمہ اللہ)

اس کتاب کے اختتام پر ہم نے ان لوگوں کے فکر وعمل پر بھی روشنی ڈالی ہے جو معتزلہ کے نقش قدم پر چل رہے ہیں اور ان کے دلوں میں صرف عقل کی ہی اہمیت ہے یہ لوگ درست مسنون طرزِ فکر وعمل سے انحراف کر رہے ہیں۔ ہماری کتاب میں یہ جو کچھ ہے، ہوسکتا ہے کہ پڑھنے والے کو بعض باتیں جو ہمارے دور میں موجود ہیں وہ تاریخی معلومات کے بغیر سمجھ میں نہ آسکیں لہٰذا تاریخ سے واقفیت اس کیلئے نہایت ہی ضروری ہے۔

پہلی فصل

جاہل دوست

اسلام کی پہلی اور اہم بنیاد توحید کا اثبات ہے اس طرح کا اثبات کہ وہ واضح ہو اور صراحتاً ہو، اس میں کسی قسم کی ملاوٹ یا التباس باقی نہ رہے اور توحید دلوں میں اس طرح راسخ ہو کہ وہ عمل پر آمادہ کرے اور شریعت کو اپنانے اور شرعی احکام کو زندگی کے ہر شعبے میں نافذ کرنے میں مُعاوِن ہو۔ پھر شرک کو جو کہ توحید کی ضد ہے اس کی نفی کرے مکمل نفی، شرک کی ایک ایک صورت کی نفی جس نام سے جس نشان سے شرک ہوتا ہو وہ نام اور نشان تک ختم کر دیئے جائیں۔

اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ہی دنیا اور انسانوں کا خالق ہے لہٰذا معبود بھی وہی ہے۔

وَهُوَ الَّذِىْ فِى السَّمَآءِ اِلٰـهٌ وَّفِى الْاَرْضِ اِلٰـهٌ . (الزخرف:۸۴)

وہی (اللہ) آسمانوں میں معبود ہے اور زمین میں بھی معبود ہے۔

ساری کائنات اللہ کے سامنے طوعاً وکرھاً مطیع وفرمانبردار ہے۔اوران احکام وہدایت کی پابند ہے جو اللہ نے ان کیلئے مقرر کی ہیں۔جبکہ انسان بالاختیار اس شریعت کا پابند ہے جو اللہ نے اپنی کتابوں میں نازل کی ہے تاکہ انسان اللہ کا عبادت گذار بنے،دل سے اللہ کو واحد معبود تسلیم کرے اور اعضاء سے اسکی اطاعت کے اعمال بجالائے۔

اس عقیدہ کو ثابت کرنے کیلئے قرآن نے ایک خاص منہج اور طریقہ مقرر کیا ہے قرآن مجید انسانی فطرت کو اس طرح مخاطب کرتا ہے کہ اسے خالق پر ایمان لانے کے معانی ومطالب سمجھا دیتا ہے اور اسے ایک اللہ ہی کی عبادت کی ضرورت بدیہانہ طور پر سمجھاتا ہے اس بات کو سمجھانے کیلئے فلسفیانہ دلائل اور اِدھر اُدھر کی ہانکنے کی ضرورت ہی نہیں۔بلکہ قرآن نے انسان کو مظاہر فطرتِ نفسی وکونی کی طرف متوجہ کیا ہے اور انہی کو بطور دلیل پیش کیا ہے۔

اَفَلَا یَنۡظُرُوۡنَ اِلَی الۡاِبِلِ کَیۡفَ خُلِقَتۡ ۝ وَاِلَی السَّمَآءِ کَیۡفَ رُفِعَتۡ ۝ وَاِلَی الۡجِبَالِ کَیۡفَ نُصِبَتۡ ۝ وَاِلَی الۡاَرۡضِ کَیۡفَ سُطِحَتۡ (الغاشیة:۱۷،۲۰)

کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ اونٹوں کو کس طرح پیدا کیا گیا ہیں اور آسمان کو کہ کس طرح بلند کیا گیا ہے اور پہاڑوں کو کہ کیسے نصب کئے گئے ہیں۔اور زمین کو کہ کیسے بچھائی گئی ہے؟

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَاب (آل عمران:۱۹۰)

آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق میں اور رات دن کے آنے جانے میں عقل والوں کیلئے نشانیاں ہیں۔

انسانوں کی توجہ ان کے وجود کی طرف دلائی گئی ہے،کائنات کی طرف اور بنجر زمین سے سرسبز وشاداب پودوں کی پیدائش کی طرف تاکہ وہ ان پر غور کریں اور پھر حق قبول کریں اور پھر عقل سے ان کو سمجھ سکیں۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ تَعٰلٰی عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ ۝ (النحل:۳)

(اللہ نے) آسمانوں اور زمینوں کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے وہ مشرکوں کے بنائے ہوئے شریکوں سے بہت بلند ہے۔

خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ نُّطۡفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِیۡمٌ مُّبِیۡنٌ ۝ (النحل:۴)

انسان کو (اللہ نے) نطفہ سے پیدا کیا۔پھر وہ واضح جھگڑا کرنے والا بن گیا۔

هُوَالَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّکُمۡ مِّنۡهُ شَرَابٌ وَّ مِنۡهُ شَجَرٌ فِیۡهِ تُسِیۡمُوۡنَ ۝ یُنۡبِتُ لَکُمۡ بِهِ الزَّرۡعَ وَالزَّیۡتُوۡنَ وَالنَّخِیۡلَ وَالۡاَعۡنَابَ وَمِنۡ کُلِّ الثَّمَرٰتِ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ ۝ وَسَخَّرَ لَکُمُ الَّیۡلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ وَالنُّجُوۡمُ مُسَخَّرٰتٌ بِاَمۡرِهٖ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ۝ وَمَا ذَرَاَ لَکُمۡ فِی الۡاَرۡضِ مُخۡتَلِفًا اَلۡوَانُهٗ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لِّقَوۡمٍ یَّذَّکَّرُوۡنَ ۝ (النحل:۱۰،۱۳)

وہی (اللہ) ہے جس نے نازل کیا آسمان سے تمہارے لئے پانی اس میں سے تم پیتے ہو اور اسی سے درخت (پیدا) ہوتے ہیں جن میں تم (مویشی) چراتے ہو۔اسی سے تمہارے لئے کھیتی،زیتون،کھجور،انگور اور ہر قسم کے پھل وہی اُگاتا ہے ان میں نشانیاں ہیں غور کرنے والوں کیلئے۔اور تمہارے لئے مسخر کردیا ہے رات،دن،سورج،چاند اور ستارے بھی اُسی کے حکم سے مسخر ہیں ان میں عقل والوں کیلئے نشانیاں ہیں اور جو رنگ برنگی چیزیں زمین میں پھیلا رکھی ہیں۔ان میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کیلئے جو نصیحت حاصل کرتے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِیۡ سَخَّرَ الۡبَحۡرَ لِتَاۡکُلُوۡا مِنۡهُ لَحۡمًا طَرِیًّا وَّتَسۡتَخۡرِجُوۡا مِنۡهُ حِلۡیَةً تَلۡبَسُوۡنَهَا وَتَرَی الۡفُلۡکَ مَوَاخِرَ فِیۡهِ وَلِتَبۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِهٖ وَلَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ ۝ (النحل:۱۴)

اور وہی (اللہ) ہے جس نے کام میں لگا دیا ہے سمندروں کو کہ اس میں سے تازہ گوشت نکال کر کھاؤ اور اس میں سے گہنا نکالو جو پہنتے ہو اور تو دیکھتا ہے کہ کشتیاں اس میں پانی چیرتی ہوئی (چلتی) ہیں اور تاکہ تم اس (اللہ) کا فضل تلاش کرو اور تاکہ تم شکر کرو۔

قرآن مجید نے انسان کو اُس کی کمزوری اور کم ہمت اور قلیل الاستعداد ہونے کا احساس دلایا بایں صورت کہ انسانی قوت اللہ کی قوت کے مقابلے میں ایک معمولی اور حقیری

مکھی کی قوت کے مساوی ہے۔

جبکہ اللہ کی قوت لامحدود ہے اس کا احاطہ عقل سے کیا ہی نہیں جاسکتا۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ٥ (الحج : ٧٣)

اے لوگو! ایک مثال بیان کی جاتی ہے اسے غور سے سنو جن لوگوں کو تم اللہ کے علاوہ پکارتے ہو وہ ایک مکھی بھی پیدا نہیں کرسکتے اگرچہ سب اس کام کیلئے جمع ہوجائیں اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین کرلیجائے تو یہ لوگ اس سے چھڑا نہیں سکتے تلاش کرنے والا اور جس کو تلاش کیا جارہا ہے دونوں کمزور ہیں۔

پھر قرآن مجید نے اللہ کی صفات بیان کی ہیں اور آسان ترین انداز اور واضح ترین الفاظ میں واضح کیا ہے۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ٥ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ٥ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ٥ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ٥ (اخلاص ١-٤)

کہہ دو کہ اللہ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ وہ جنا گیا۔ اور اس کا کوئی برابری کرنے والا نہیں ہے۔

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ٥ (الشوریٰ : ١١)

اس کے مثل کوئی نہیں اور وہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔

پھر قرآن نے اللہ کی اپنی مخلوق کی ربوبیت کرنے کے دلائل میں سے ایسے دلائل دیئے ہیں جو ایک اللہ کی عبادت اور بلا شرکتِ غیر اُسی کو تنہا معبود ماننے کے وجوب پر مکمل دلالت کرتے ہیں کہ جو ذات پیدا کرنے والی ہے وہی عبادت کے مستحق ہے جو رزق دینے والی ذات ہے وہی پکارے جانے کے لائق ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ٥ (آل عمران:٥١)

اللہ میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی، اسی کی عبادت کرو، کہ یہی سیدھا راستہ ہے۔

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ٥ (انبیاء : ٩٢)

تمہارا یہ دین حقیقت میں ایک ہی دین ہے اور میں تمہارا رب ہوں لہٰذا میری عبادت کرو۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ٥ (الانعام : ١٠٢)

وہ اللہ ہی تمہارا رب ہے اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں وہ ہر چیز کا خالق ہے اس کی عبادت کرو۔

فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ٥ (المؤمن : ١٤)

اس اللہ کو پکارو اس کیلئے دین کو خالص کرتے ہوئے اگرچہ کافر ناپسند کریں۔

دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں جو نفع ونقصان کی طاقت رکھتی ہو سوائے اللہ کے، اس کی اطاعت، عبادت اور اس کے دین وشریعت کو اپنانا ہی دراصل اس کی توحید کا مظہر ہے اور یہ اس کی مخلوق پر لازم ہے جس طرح کہ خالص اسی کی عبادت کرتے ہوئے غیر اللہ کی عبادت کی نفی کے ساتھ اللہ نے ہمیں خبردار کیا، کسی بھی قسم کی عبادت ہو یعنی دعا صرف اللہ سے کی جائے گی، شریعت صرف اسی کی مانی جائے گی، محبتِ الوہیت صرف اسی اللہ سے رکھی جائے گی اُس کے علاوہ کسی کیلئے یہ کام نہیں کرنے ہے۔

قرآن نے اتنے واضح، عمدہ اور آسان وعام فہم انداز واسلوب سے توحید کو ثابت کیا ہے کہ کوئی بھی درست صاحب فہم اس کے ذریعے سے حق کی گہرائی تک پہنچ جاتا ہے اور اسے عقیدے کے طور پر اپنا لیتا ہے اپنے شعور کی صلاحیتوں کو اس عقیدے کے ذریعے اس حد تک پروان چڑھا لیتا ہے کہ اپنے رب سے تعلق پیدا کرلیتا ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قرآن کے بیان کردہ عقائد واحکام کو قرآن کے بیان کردہ اسلوب کے ذریعے سے ہی سمجھا اور پھر اس میں سے محکمات کو عمل میں برقرار رکھا اور متشابہات کو محکمات کی طرف ردّ کیا تاکہ حق نکھر کر سامنے آجائے۔ انہوں نے قرآنی آیات کو باہم ٹکرایا نہیں، انہیں ایک دوسرے کے معارض نہیں بنایا، قرآن کو ٹکڑوں میں تقسیم نہیں کیا، انہوں نے فقط گفتار سے نہیں بلکہ قرآن کے احکام پر عمل کرکے اس کی حقانیت وسچائی کو ثابت کیا تو اللہ نے انہیں کئی ممالک کی فتوحات نصیب فرمائی یہاں تک کہ ان کے نقش قدم پر چلنا ہی ہدایت کہلایا اور ان کی پیروی سے انحراف گمراہی قرار پائی۔

مگر افسوس! کہ بعد کے ادوار میں یہ سلسلہ اس طرح برقرار نہ رہ سکا ابھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا دور ختم ہی ہوا تھا، مما لک فتح ہو گئے تھے کہ مسلمان ان نظریات وافکار سے متاثر ہونا شروع ہو گئے جو انہیں باہر سے ملے یہاں تک کہ مفتوحہ مما لک وعلاقے مخلوط افکار ونظریات کا شکار ہو گئے اور غیر مسلم جو اسلام میں داخل ہو رہے تھے ان میں سے اکثر ایسے تھے جو اپنے سابقہ افکار، نظریات، عقائد، رسوم وثقافتیں ساتھ لاتے رہے گمراہ کن افکار اور قدیم جاہلانہ مذہبی تصورات سمیت اسلام میں داخل ہونے کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اسلام کی سرزمین میں فتنوں کا بیج بن گئے ان کی آمد سے وہی اضطراب پیدا ہوا جو اختلاف وانشقاق سے پیدا ہوتا ہے اس فتنے کے بیج اور مسلمانوں کے اضطراب، اختلاف وافتراق کا سب سے بڑا سبب ان مذاہب کی کتب کے تراجم تھے خاص کر یونانی فلسفیوں کی کتب کے ترجمے۔ ان کا فلسفہ ومنطق ہی اسلام کو نقصان پہنچانے اور اس میں غیر اسلامی افکار داخل کرنے کا سبب بنا۔

ان تمام عوامل کا نتیجہ جو برآمد ہوا وہ علم کلام کی ترقی ونشو نما ہے جسے ان لوگوں نے علم التوحید قرار دیا تھا (حالانکہ اس کا توحید سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا)۔ ابتداء ہی میں علم کلام کی ارتقاء فرقہ معتزلہ کے ظہور کی وجہ سے ہوئی جب اعتزال کو حقیقی اسلام کہا جانے لگا۔ پھر رفتہ رفتہ علم کلام معتزلہ کے علاوہ دیگر گمراہ فرقوں میں بھی سرایت کر گیا جیسے روافض، مرجئہ وغیرہ۔ بلکہ ابوالحسن الاشعری کے زمانے میں تو بہت سے علماء کی کتب میں علم کلام شامل بھی ہوا اور یہ سلسلہ بعد میں بھی جاری رہا (ابوالحسن اشعری کا نام علی بن اسماعیل ہے۔ ۲۶۰ھ میں پیدا ہوا۔ علم اعتزال میں مہارت حاصل کی مگر پھر اس سے براءت کا اعلان کیا اور ایک اور کلامی مذہب کی بنیاد رکھی جو اس کے نام سے مشہور ہوئی جس میں اس نے معتزلہ اور اہل السنۃ میں موافقت پیدا کرنے کی کوشش کی پھر آخری عمر میں سلف صالحین کے عقیدے کی طرف لوٹ آئے) رحمہ اللہ

(الابانة عن اصول الديانة،يسر اعلام النبلاء للذهبي:۸۵/۱۵)

ابوالحسن اشعری کے نام پر بننے والے فرقے الاشاعرہ کے علماء اگرچہ چند مسائل میں معتزلہ کے خلاف تھے مگر عقائد میں علم کلام کو ہی استعمال کرتے تھے اس طریقہ کو اپنانے والوں کو متکلمین کہا جاتا تھا متکلمین معتزلہ اور متکلمین اشاعرہ اور متکلمین روافض۔ اگرچہ چند مسائل صفات وقدر میں علم کلام معتزلہ سے پہلے رائج ہو گیا تھا مگر دوسری صدی ہجری میں معتزلہ کے وجود میں آنے اور ترقی کرنے کے ساتھ ساتھ علم کلام نے بھی ترقی شروع کی صفات وقدر میں قدریہ فرقہ معبد جہنی اور جعد بن درہم کے ذریعے جبکہ جہمیہ جہم بن صفوان کے ہاتھوں داخل ہوا۔ قدریہ نے تقدیر کی نفی کر دی، جہمیہ نے صفات کا انکار کیا جبکہ یہ دونوں خرابیاں بیک وقت معتزلہ میں پائی جاتی ہیں یعنی قدر وتقدیر اور صفات کا انکار۔

دیگر سابقہ فرقوں اور معتزلہ میں فرق ان کا یہ قول بنا کہ مسلمانوں میں سے جو شخص گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو جائے تو وہ نہ مؤمن رہتا ہے نہ کافر بنتا ہے بلکہ ان دونوں کے درمیان ایک اور درجہ ہے جس پر یہ شخص پہنچ جاتا ہے پھر رفتہ رفتہ دیگر مسائل سامنے آتے گئے اور لوگوں کی عقول کو مصروف کرتے گئے اور دلوں کو اپنی طرف مائل کر گئے زبانوں پر بلا دلیل مسائل جاری کر گئے اس طرح مسلمان معاشرہ میں بہت بڑی بربادی پھیل گئی معاشرے میں جس کے بہت برے نتائج سامنے آرہے ہیں۔

پہلے ہم نے ذکر کیا کہ علم کلام معتزلہ کے وجود میں آنے کے ساتھ ہی پروان چڑھا ہے اگرچہ بعد میں دیگر فرقوں میں بھی سرائیت کر گیا ہے۔ لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہ بھی بتاتے چلیں کہ معتزلہ کے علاوہ اہل سنت نے علم کلام کے خلاف کون سے ماخذ سے دلیل لی ہے۔ اور یہ بھی بتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ علم مسلمانوں میں اس وقت سے پھیلا ہے جب سے مسلمانوں میں کمزوری واضمحلال آیا ہے اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ چونکہ یہ معاملہ تفصیل طلب ہے اس لیے ہم اس کو تمام تر جزئیات کے ساتھ لکھنا چاہتے ہیں سب سے پہلے اس علم کی تعریف کریں گے کہ علم کلام ہے کیا؟ پھر اس کی کچھ مثالیں دیں گے اور پھر ہم وہ ماخذ ذکر کریں گے جہاں سے معتزلہ نے علم کلام اخذ کیا ہے۔

علم کلام کی تعریف اور چند مثالیں

علم کلام کے ماہرین میں اس علم کی تعریف پر اختلاف پایا جاتا ہے کچھ کے نزدیک اس کی تعریف ہے۔ عقائد کا علم یقینی (عقلی) دلائل کے ذریعے سے حاصل کرنا۔

متقدمین نے اس علم کی غرض یہ بتائی کہ اللہ کے بارے میں معلومات کسی نے کہا کہ اس علم کا موضوع ہے اللہ تعالیٰ کی ذات، یا اللہ کی ذات اُس کی ذات کی ممکنات کے ساتھ۔ یہی وجہ ہے کہ اس علم میں اللہ کی صفات ثبوتی وسلبی سے بحث کی جاتی ہے اور اس کے ان افعال سے بحث ہوتی ہے جن کا تعلق دنیا وآخرت سے ہے۔ ابن خلدون نے یوں تعریف کی ہے ''عقائد (ثابت کرنے) کیلئے عقلی دلائل لانا'' (مقدمة ابن خلدون:۴۵۸)

یہ زیادہ واضح تعریف ہے اس لیے کہ کسی علم کی صحیح تعریف وہی ہوتی ہے جس سے اس علم کے اہداف ومقاصد بھی بیان ہوجائیں جو کہ اس تعریف میں موجود ہیں اسی طرح اکثر متکلمین اسلام کیلئے عقلی دلائل ہی زیادہ پیش کرتے ہیں ان کا خیال ہے (اگر چہ غلط ہے) اسلام اپنے اظہار کے لئے ایک ایسے سانچے کا محتاج ہے جس کا ظاہر عقلی ہے او رباطنی لحاظ سے جدلی ہے۔ ہم اس مقام پر دو مثالیں پیش کرنا چاہتے ہیں تا کہ متکلمین کا وہ طریقہ سمجھ میں آسکے جس طریقے سے وہ اسلامی عقیدہ کے مسائل ثابت کرتے ہیں۔

❶ اللہ تعالیٰ کے وجود کا ثبوت

علماء کلام نے اللہ کے وجود کو ثابت کرنا چاہا اور پھر اس کے بعد نبوت کو تا کہ نبوت کے ذریعہ سے دینی معلومات حاصل کی جاسکیں اور یہ معلومات یقین پر مبنی ہوں یعنی عقلی طور پر ثابت ہوسکتی ہوں۔ اس مقصد کیلئے انہوں نے دو مشہور دلیلوں سے استدلال کیا ہے۔

① **حدوث کی دلیل:** اس کا خلاصہ یہ ہے کہ عالم میں موجود اجسام اجزاء سے بنتے ہیں پھر ان اجزاء کی مزید اجزاء کی طرف تقسیم ممکن ہے اسی طرح مزید تقسیم در تقسیم۔ اتنی تقسیم کہ جس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اس طرح ہوتے ہوتے اس جزء تک پہنچ جائیں کہ جو تقسیم قبول نہیں کرتا (جزء لا یتجزء) یہ جزء جو تقسیم قبول نہیں کرتا اسے جوہر فرد کہتے ہیں، ہر جوہر کو مختلف حالتیں درپیش ہوتی ہیں۔ جیسے حرکت وسکون وغیرہ ان حالات کو (علم کلام کی اصطلاح میں) اعراض کہا جاتا ہے۔ اعراض حادث ہیں اس لیے کہ ان میں تغیر ہوتا ہے اور جواہر کبھی بھی اعراض سے علیحدہ نہیں ہوسکتے جب اعراض حادث ہیں تو اس طرح جواہر بھی حادث ہوگئے۔ اور اجسام بھی حادث ہوگئے۔ اور عالم بھی (جب یہ سب حادث ہیں) تو پھر ضروری ہے کہ ان کیلئے کوئی مُحدِث (پیدا کرنے والا) بھی ہو۔ اور وہی اللہ ہے۔ (حادث بمعنی پیدا ہونے والی)

② **ممکن اور واجب کی دلیل:** خلاصہ اس کا یہ ہے کہ عالم میں جو کچھ موجود ہے ان کیلئے یہ ممکن تھا کہ موجودہ شکل کے بجائے ان کی بالکل مختلف شکل ہوتی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اس جہاں سے زیادہ بہتر جہاں پیدا کردے بلکہ اس عالم میں ممکن ہے کہ پتھر اوپر کی طرف چڑھ جائے اور آگ کا شعلہ نیچے کی طرف گرے۔ جب یہ سب ممکن ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ عالم حادث ہے اور اس کیلئے مُحدِث (پیدا کرنے اولا فنا کرنے والا) موجود ہے اور وہی اللہ ہے!۔

(دراسات فی الفلسفة الاسلامیه لمحمود قاسم : ۱۳٤ ـ فتاویٰ ابن تیمیة رحمہ اللہ : ۲/۲۲)

❷ یوم آخرت کا ثبوت

یوم آخرت ثابت کرنے کیلئے علماء کلام نے ایسا جدلی طریقہ اختیار کیا ہے جو مُسلَّم منطق عقل سے بھی بہت بعید ہے۔ کہتے ہیں یوم آخرت کا وجود ممکن ہے اس لیے کہ اگر یوم آخرت کا وجود فرض کرلیا جائے تو اس کے وجود کا فرض کرلینا محال نہیں ہے! لہٰذا اس کے وجود سے عقلاً کونسی چیز مانع ہے؟ اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ ان کا یہ جدلی طریقہ کسی ماہر مخالف جدلی کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا۔ جیسا کہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ان کے اس قول کے ردّ میں فرمایا ہے۔ کسی چیز کے واقع ہونے کے امکان سے اس چیز کا لازمی طور پر یقینی وقوع مُراد نہیں ہوتا ایسے بہت سے ممکنات ہیں جن کا شمار کرنا محال ہے مگر موجودات ان ممکنات کا ایک حصہ ہے تو بقول اُن کے (کہ آخرت کا دن امکان وقوع ظنّی طور پر ماننے سے کوئی مانع نہیں) ہوسکتا ہے کہ یوم آخرت اُس ممکن الوقوع میں سے ہو جس کا وقوع مُتحقّق نہ ہو؟! جہاں تک بات ہے کہ اہل سنت نے علم کلام اور اس کے طریقے کی مخالفت میں دلائل کہاں سے لیے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان کے دلائل دو قسم کے ہیں:

① **عقیدہ پیش کرنے کے بارے میں علم کلام کا منہج وطریقہ قرآنی منہج کے خلاف ہے۔**

اس بحث کے آغاز میں ہم نے ذکر کیا کہ قرآن کا انداز تخاطب کیا ہے؟ قرآن فطرت، عقل، قلب وشعور کو بیک وقت مخاطب کرتا ہے۔ یہ ہم اختصار سے بتا چکے اس کی کچھ مزید تفصیل عرض کیے دیتے ہیں تا کہ یہ معلوم ہوسکے کہ علم کلام نے جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ مشکل سے سمجھ میں آنے والا ہے۔ (ان کے نتائج کی خرابیوں سے قطع نظر) نہ یہ طریقہ قرآنی وشرعی ہے نہ ہی عقلی حجت کی قوی عقل جو اکثر اوقات درست استنباط کو تسلیم کرنے کی صلاحیت رکھے اس کی ثابت شدہ دلائل کے سامنے سہارا دے۔ ہم اپنی گفتگو اس ترتیب سے کرتے ہیں کہ سب سے پہلے ہم متکلمین کا طریقۂ ثبوت یوم آخرت پر بحث کرتے ہیں کہ ان کے اور قرآن کے طریقہ میں کتنا واضح فرق ہے۔

قرآن نے یوم آخرت کو آسان فہم دلائل سے ثابت کیا ہے اس کے برعکس علم کلام نے پہلے اسے قضیہ ذھنیہ کے ذریعے سے ثابت کیا کہ یوم آخرت کا وجود محال نہیں ہے

پھر اس کے بعد وجود حقیقی کی طرف منتقل ہوئے ہیں اور بنیاد وہی قضیہ ذھنیہ ہے ۔جبکہ قرآن نے عقلی،حقیقی اور آسان طریقہ اختیار کیا ہے تا کہ مضبوط نتیجے پر پہنچا دے۔انسان کو اشیاء کے وجود کے امکان کا علم ہے کبھی تو اسے یہ علم کسی شیٔ کی نظیر ومشابہ چیز کو دیکھ کر ہوتا ہے یا اس چیز سے بڑی اور بہتر چیز کو دیکھ کر۔اگر ان دونوں طریقوں میں سے کسی ایک طریقے سے کسی چیز کا امکان ثابت ہوجائے تو ضروری ہے کہ ممکن الوقوع چیز کے وجود کو ثابت کرنے پر اللہ کی قدرت بیان کی جائے کہ اُسی کو یہ قدرت ہے۔اگر یہ ثابت ہوجائے تو پھر اُس فائدہ کا بیان واجب ہے جو اس امکانی فعل کے ایجاد پر مرتب ہوتا ہے۔اس لیے کہ کسی فعل کے ثابت ہونے کا امکان اور اس چیز کو وجود میں لانے کی اللہ کی قدرت اس بات کا ثبوت نہیں کہ وہ چیز لازمی طور پر اللہ وجود میں لے آئے ۔بلکہ اللہ اُس چیز کو وجود بخشتا ہے جو اللہ کی حکمت کے پیشِ نظر ہو کہ اُسی میں فائدہ اور خاص مقصد اور ثابت کی گئی مصلحت باقی رہتی ہیں۔(یعنی ایجادِ شئی اللہ کی حکمت پر موقوف ہے) قرآن نے اسی چیز کو اس بہترین طریقے سے بیان کیا ہے۔ارشاد ہے:

وَهُوَ الَّذِىْ يَبْدَؤُاالْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ ٥ (الروم : ٢٧)

اللہ وہ ذات ہے جو ابتداء میں بھی تخلیق کرتا ہے اور پھر دوبارہ اسے لوٹا دیتا ہے یہ اس پر زیادہ آسان ہے۔

اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ بَلْ هُمْ فِىْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ٥ (قٓ : ١٥)

کیا ہم پہلی بار پیدا کر کے تھک گئے؟ بلکہ یہ لوگ نئی پیدائش کی طرف سے شک میں ہیں۔

اس آیت میں قرآن نے یوم آخرت کے وجود کا امکان ثابت کر دیا ہے اس لیے کہ اس کی نظیر پہلے پیدا کی جا چکی ہے بلکہ دوبارہ کسی چیز کو پیدا کرنا زیادہ آسان ہے۔

اَوَلَيْسَ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ بَلٰى وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ٥ (یٰسٓ : ٨١)

وہ ذات جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمینوں کو کیا وہ اس بات پر قادر نہیں کہ ان جیسے اور پیدا کرے؟ کیوں نہیں وہ پیدا کرنے والا بہت علم والا ہے۔

اس پر اللہ کی قدرت واضح ہوجاتی ہے۔

لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰى ٥ (طٰہٰ : ١٥)

تا کہ ہر نفس کو اس کی کوشش کا بدلہ دیا جائے۔

جس یوم آخرت کو قرآن نے عملاً ثابت کر دیا ہے وہ اللہ کی بلند حکمت کیلئے ہے تا کہ عدل الٰہی اس کے ذریعے ثابت ہوجائے اور ثواب وعذاب کا ذریعہ بن جائے۔

قرآن کریم نے اللہ کو شرک اور بیٹوں کی صفت سے پاک رکھنے کیلئے بھی بہترین وآسان فہم اسلوب اپنایا ہے۔

وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنَاتِ سُبْحٰنَهٗ وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ٥ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ٥ (النحل : ٥٧،٥٨)

یہ لوگ اللہ کیلئے بیٹیاں ٹھہراتے ہیں وہ اللہ پاک ہے اور ان کیلئے وہ (بیٹے) جو یہ چاہتے ہیں! جب ان میں سے کسی کو بیٹی پیدا ہونے کی خبر دی جاتی ہے تو (دکھ کی وجہ سے) اس کا چہرہ سیاہ ہوجاتا ہے اور وہ غم سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔

ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِىْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۔ (الروم:٢٨)

اللہ تمہارے ہی نفسوں میں سے تمہارے لئے سے ایک مثال پیش کرتا ہے دیکھو جو تمہاری ملکیت ہیں (غلام،لونڈیاں،نوکر) کیا وہ تمہارے اس مال میں سے جو ہم نے تمہیں دیا ہے شریک ہیں تم سب اس میں برابر (کے حصے دار) ہو؟ کیا تم ان سے اسی طرح ڈرتے ہو (مال کے تصرف وخرچ کرنے میں) جس طرح کہ اپنوں کا خطرہ رکھتے ہو؟

اللہ تعالیٰ یہ ثابت کررہا ہے کہ تم اپنے آپ کو عیب ونقص والے کاموں اور صفات سے پاک رکھتے ہو،بیٹیوں کو ناپسند کرتے ہو بیٹوں کو پسند کرتے ہو تو تم دوسروں کیلئے کیوں بیٹیاں ٹھہراتے ہو؟ اسی طرح دوسری مثال میں سمجھایا کہ جب تم پسند نہیں کرتے کہ تمہارا غلام یا ملازم تمہارے مال میں شریک ہو تمہاری برابری پر آئے تو تم کس طرح مخلوق کو خالق کا شریک بناتے ہو اور یہ دعویٰ کرتے ہو کہ اللہ کے علاوہ ان کی بھی عبادت ہو؟۔اللہ کا فرمان ہے:

فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ٥ (البقرة : ٢٥٩)

اللہ نے اسے موت دیدی پھر اٹھادیا۔

اس آیت کے ضمن میں سید قطب شہید رحمہ اللہ فرماتے ہیں ''قرآنی منہج اور اسلوب بیان متکلمین کے طرز کے برعکس ہے وہ موضوعات جو انسانی شعور ونفسیات، عقل اور دل کو متاثر کرتے ہیں اور جو انسان کے ایمان میں اضافے کا سبب بنتے ہیں ان موضوعات کو خشک اور غیر دلچسپ انداز سے بیان نہیں کرتا جیسا کہ مذکورہ آیت میں بیان ہوا ہے کہ جب اللہ نے ایک شخص کو مشاھداتی طور پہ باور کرانا تھا اور یقین دلانا تھا کہ مرنے کے بعد زندہ کرنا میرے لئے آسان ہے تو اسے صرف لفظوں کے ذریعے یا باطل استدلالی طریقے سے نہیں سمجھایا بلکہ اس کو موت دیدی پھر زندہ کردیا اور پھر اسی کو اس کے گدھے کے زندہ ہونے پر گواہ بنایا کہ اس نے اپنی آنکھوں سے گدھے کو زندہ ہوتے دیکھا۔(عن ظلال القرآن : ۱/۳۰۰)

اس کے برعکس علم کلام کا طریقہ یہ ہے کہ وہ فریق مخالف پر اعتراضات کرتا ہے اس کے مسلمہ اصولوں یا باتوں پر مواخذہ کرتا ہے، اعتراضات اور سوالات اور نکتہ چینی کرتا ہے، اشکالات سامنے لاتا ہے اور پھر اس کے حل میں مصروف ہوجاتا ہے۔(المنقذمن الضلال،الغزالی)

جبکہ قرآن کا منہج یہ ہے کہ وہ مکمل طور پر فطرت کی طرف متوجہ کرتا ہے بشری طبیعت کو اس کے تمام تر لوازمات کے ساتھ یکبارگی مخاطب کرتا ہے اس کی مثال اس رواں پانی کی سی ہے جس سے ایک شیر خوار بچہ اور پختہ ذہن آدمی دونوں بیک وقت سیراب ہوسکتے ہیں اس خوبی کے مدنظر سلف صالحین نے عقیدہ کا مسئلہ سمجھانے کیلئے یہی طرز اپنایا ہے مثلاً امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب کی ابتداء وحی کے آغاز اور نزول سے کی ہے جس میں انہوں نے بتایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر علم اور ایمان پہلے نازل ہوئے پھر اس باب کے بعد کتاب الایمان لائے جس میں بتایا گیا کہ ایمان اس شریعت اور ان احکام کو تسلیم کرنے کا نام ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں اس کے بعد امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب العلم میں یہ بیان کیا ہے علم نام ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کو جاننے کا اس طرح امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح اور حقیقی ترتیب اپنائی ہے۔(مجموع الفتاوی ابن تیمیۃؒ:۲/٤)

اس منہج کی پیروی ہی ہدایت اور حکمت ہے جبکہ متکلمین کے منہج کے پیچھے چلنا، اسے اپنانا دیوانگی اور اندھا پن اور زبردستی کی مشقت خود پر لادنا ہے۔مندرجہ ذیل مثال ہماری اس بات کی وضاحت کیلئے کافی ہے جو علامہ عبدالرحمٰن بن یحیی المعلمی الیمانی نے پیش کی ہے کہتے ہیں۔

(شرح مواقف پر حواشی عبدالحکیم میں لکھا ہے:)

> ''میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ یہاں کوئی ایجاد نہیں ہے بلکہ یہ جو کچھ (کائنات میں) نظر آرہا ہے وہ صرف وجود کے ماہیت کی پیروی ہے جبکہ مقتضی کیلئے لازم نہیں کہ وہ موجد بھی ہو کیا آپ دیکھتے نہیں کہ ماہیات اپنے لوازم کا تقاضا کرتی ہیں مگر وہ ان لوازم کو پیدا نہیں کرسکتیں؟ یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے اس لیے کہ ایجاد ایک خارجی چیز ہے اس کے لیے موجود اور موجد کا خارج میں ہونا ضروری ہے جبکہ خارج میں وجود ماہیتِ حقیقت کے سوا کچھ بھی نہیں اور یہ جو تعدد کا اعتبار ہے تو یہ اس لحاظ سے ہے کہ یہ مُوجِد ہیں جبکہ وجود پر یقین کرنے کی جہاں تک بات ہے تو یہ صرف ذہن میں مُوجَد ہے۔شیخ یمانی فرماتے ہیں جس کو یہ بات سمجھ میں آگئی اور اس نے اس پر قناعت کرلی تو ٹھیک ہے۔ورنہ بہتر یہ ہے کہ تعمق کو چھوڑ کر یقین کی طرف آجائے یقین کی طرف آنے کا مطلب ہے یہ یقین کرنا کہ اللہ عزوجل ہی حق ہے، ہمیشہ رہنے والا ہے، ہر چیز کا خالق ہے اور پھر اللہ سے دعا کرے کہ غلط سوچ وفکر سے، نظریات وافکار سے محفوظ رکھے اور خود بھی رک جائے، اکابر میں سے ایک صاحب سے میں نے سنا وہ اپنے دادا کے بارے میں بتارہے تھے کہ جب ان کے سامنے کوئی ''علم التوحید'' (علم الکلام) کا نام لیتا تو وہ کہتے یہ ''علم التوحید'' نہیں علم التوحیل (کیچڑ میں گرانے والا علم) ہے(القائدالی تصحیح العقائدللمعلمی الیمانی:۱۳۵)

② اہلسنت نے علم کلام کی مخالفت اس وجہ سے بھی کی ہے کہ اس علم نے توحید عبادت سے لوگوں کو غافل کردیا ہے جو کہ انبیاء کی بعثت کا اصل مقصد تھا۔علم التوحید علم کلام کے نام سے اس لیے مشہور ہوا کہ اس کا موضوع بھی علم توحید کی طرح اللہ کی ذات، صفات اور افعال ہیں۔دوسری وجہ یہ ہے کہ جب متکلمین اور دیگر باطل عقائد صابئین، یہود، نصاریٰ، مجوس کے درمیان مناظرے ومناقشات ہوئے اور یہ مناظرے اللہ کی ذات اور اس کی صفات، قضاء وقدر کے بارے میں اسی یونانی اسلوب کے مطابق ہوئے جس کی طرف ہم نے پہلے اشارہ کیا تو ارباب علم نے اس علم کی ایک اعتبار سے اہمیت کے پیش نظر اس نام کو استعمال کرنا شروع کردیا کیونکہ ان علماء کا یہ خیال تھا کہ رسولوں کی بعثت کا مقصد صرف توحید ربوبیت کی تبلیغ تھا حالانکہ ان دونوں علوم کو باہم متشابہ قرار دینا غیر ضروری اور زبردستی کی نسبت ہے علماء کو شاید اس کا یہ فائدہ ملتا ہو کہ طلبہ ان کے فریب سے متاثر ہوں اور اس کا علم حاصل کریں اس غلط فہمی کی بنیاد پر کہ شاید علم کلام کے اصول تسلیم شدہ ہیں۔اس طرح علم کلام کو علم توحید قرار دینے کا نتیجہ

یہ نکلا لوگوں کے ذہن میں توحید سے مراد صرف توحید ربوبیت ہی راسخ ہوگیا کہ اللہ خالق ہے، مالک ہے اس کی کچھ صفات ثابت ہیں اور کچھ نہیں ہیں حالانکہ قرآن نے یہ ثابت کیا ہے کہ اللہ ہی خالق ہے، عدم سے وجود میں لانے والا ہے، رازق ہے، مصور ہے اس کے خوبصورت نام ہیں، اعلیٰ صفات ہیں اور فقط اس پر بھی اکتفا نہیں کیا اس لیے کہ یہ باتیں تو کفار قریش کے عقیدے میں شامل تھیں وہ بھی ان کے قائل تھے۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ O (العنکبوت : ٦١)

اگر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ان سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمینوں کو کس نے پیدا کیا ہے اور سورج چاند کو کس نے تابع کیا ہے یہ کہیں گے اللہ نے۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ O (العنکبوت : ٦٣)

اگر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ان سے پوچھیں کہ کس نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس کے ذریعے زمین کو سرسبز کیا بنجر ہونے کے بعد تو یہ کہیں گے اللہ نے.

اللہ کی ربوبیت یا خالقیت کی صفت میں تو مشرکین کے ساتھ کوئی اختلاف نہیں تھا اصل اختلاف تو اس میں تھا کہ لوگ جب اللہ کو خالق ورازق مان رہے ہیں تو پھر اس کی عبادت میں توحید کو کیوں نہیں اپناتے، اس اکیلے کی اطاعت مطلقہ کیوں نہیں کرتے، اس کے اوامر ونواہی کا لحاظ کیوں نہیں کرتے؟ اسی وجہ سے تو انبیاء اپنی قوموں کو دعوت دیتے تھے کہ۔

يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ O (الاعراف : ٦٥)

میری قوم اللہ کی عبادت کرو اس کے علاوہ تمہارا کوئی معبود نہیں ہے۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ O (الانعام : ١٠٢)

وہی اللہ تمہارا رب ہے اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں وہ ہر چیز کا خالق ہے اسی کی عبادت کرو۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ ''اس طرح ہمیں اس غلطی کا اچھی طرح اندازہ ہوجاتا ہے جو علم کلام کو علم توحید کا نام دینے میں ہوئی ہے۔ اس لئے کہ اکثر متکلمین جو علم کلام کی کتب میں توحید کا اقرار کرتے ہیں ان کا مقصد ومطمع نظر یہ ہوتا ہے کہ انہوں نے توحید کو تین اقسام میں تقسیم کردیا ہے کہ وہ واحد ہے اپنی ذات میں، واحد ہے اپنی صفات میں اس کا مُشابہ کوئی نہیں اور واحد ہے اپنے افعال میں اس کا کوئی شریک نہیں ان کے نزدیک مشہور ترین توحید تیسری ہے یعنی توحید الافعال کہ عالم کا خالق ایک ہے یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہی وہ توحید ہے جس کا تقاضا ہم سے شریعت کرتی ہے اور یہی معنی ومراد ہے لا الٰہ الا اللہ کا یعنی الٰہیت کا معنی ان کے خیال میں ہے تخلیق کی قدرت وطاقت۔'' (فتاویٰ ابن تیمیہ رحمہ اللہ : ٣/٩٨)

اس طرح گویا متکلمین نے سارا زور اس (توحید) کو ثابت کرنے پر لگایا جس کا اقرار مشرکین مکہ بھی کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ عقیدہ اسلامیہ میں مراد توحید اور علم کلام میں مراد توحید میں بہت بڑا فرق آگیا ہے اور اس فرق کی وجہ سے اطاعت واتباع کا مفہوم بھی دھندلا گیا ہے۔ یہاں تک کہ اب اطاعت کا مفہوم صرف شعائر کی ادائیگی کا نام رہ گیا ہے اور جب ایسا دور آیا کہ شریعت مسلمانوں کی زندگی سے دور ہونے لگی اور تحاکم غیر اللہ کی شرع کی طرف ہونے لگا تو لوگوں کیلئے الجھنیں پیدا ہوئیں اور علم کے ان دعوے داروں کیلئے اس عظیم واہم امر سے چشم پوشی کرنا نہایت ہی آسان ہوا اس لیے کہ توحید ربوبیت تو حاکم ومحکوم دونوں کے دلوں میں موجود ہے ''توحید'' کے بارے میں کتب بڑی تعداد میں لکھی جاچکی ہیں لوگ ان کو پڑھتے پڑھاتے ہیں۔ حالانکہ یہ ہماری نظر میں توحید حقیقی کے معانی سے انحراف کا بدترین نتیجہ برآمد ہوا اور مسلمانوں کی زندگی واسلامی معاشرہ میں اس کے بدترین نتائج سامنے آئے۔

③ اہلسنت نے علم کلام کی مخالفت جن وجوہات کی بنا پر کی ہے ان میں سے تیسری وجہ یہ ہے کہ دین کیلئے وہ اصول وضع کیے گئے جو اللہ اور اس کے رسول نے بیان کیے ہی نہیں۔ علماء علم کلام نے کچھ اصول بنا رکھے ہیں مشکلات اور ان کے حل کیلئے۔ ان کے مقدمات ولوازمات وضع کیے ہیں انہیں وہ اصول دین کہتے ہیں اور مسلمانوں کیلئے ان اصولوں سے واقفیت لازمی قرار دی ہے تاکہ ان کا اسلام صحیح ہوسکے مثلاً مسلمان کیلئے یہ جاننا ضروری ہے کہ عالم حادث ہے۔ تباین کے دلائل، جوہر، عرض، حرکت وسکون کے قواعد سے واقفیت ضروری ہے۔ ایسے ہی دیگر قواعد واصول ہیں جن کا جاننا وہ مسلمان کیلئے ضروری قرار دیتے ہیں۔ بلکہ بعض علمائے علم کلام نے تو ان کا جاننا واجب قرار دیدیا ہے۔ شہادتین کا اقرار ان کے ہاں پہلا واجب نہیں بلکہ یہ اصول واجب ہیں۔ قاضی ابوبکر باقلانی نے عقلی مقدمات وضع کیے ہیں جن پر دلائل کو موقوف رکھا وہ اصول یہ ہیں۔ اثباتِ جوہرِ فرد وخلاء اور اس بات کا ثبوت کہ عرض، عرض کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتا اور اس بات کو ثابت کرنا کہ عرض دو زمانوں میں

باقی نہیں رہتا ایسے ہی دیگر اصول ہیں جن پر ان کے دلائل قائم ہیں اور انہی قواعد موضوعہ کو ایمانی عقائد کے لئے اُن کے اعتقاد کے وجوب میں خادم مانا۔(صدیق حسن خان ابجد العلوم ۲۰/ ٤٥٠)

① امام اشعری جو اس فن کلام کے امام ہیں کہتے ہیں کہ مسلمان کی سب سے پہلی ذمہ داری ہے معرفت۔

② استاد ابو اسحاق اسفرائینی کہتے ہیں۔ایسی فکر ونظر جو معرفت تک پہنچانے والی ہو۔

③ قاضی باقلانی۔نظر(منطق کی اصطلاح میں نظر کا مطلب ہے دو معلوم قضیوں کو ملا کر تیسرا نا معلومقضیہ معلوم کرنا)(مترجم)

④ امام الحرمین۔نظر کا قصد کرنا یعنی دل کو دیگر مصروفیات سے خالی کر دینا۔

⑤ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ مسلمان کی پہلی ذمہ داری ہے،تقلید۔

⑥ شہادتین کا اقرار!!

الجوہرہ کے شارح نے مسلمان کی سب سے پہلی ذمہ داری کے بارے میں لوگوں کے اقوال نقل کئے ہیں جن میں سے اہم اقوال مندرجہ بالا ہیں۔

ان اقوال کو ذکر کرنے کے بعد شارح نے پہلے تین اقوال کی تصحیح پر کلام کیا ہے اور فرماتے ہیں۔مسلمانوں کی پہلی ذمہ داری ہے معرفت کی انتہاء تک پہنچنا اور دوسری ذمہ داری نظر کی تربیت کے ذریعے کا حصول اور تیسری ذمہّ داری نظر تک پہنچنے کا بہترین اور حتمی ذریعہ،اس طرح شارحُ الجوہرہ نے تینوں اقوال میں تطبیق پیدا کی ہے حالانکہ یہ جو کچھ بیان ہوا ہے دین کا معمولی سا علم رکھنے والا بھی سمجھ جاتا ہے کہ یہ دین اسلام کے مخالف ہے اس لیے کہ اسکی پہلی ذمہ داری ہے شہادتین کا اقرار،اس کے معنیٰ کا اعتقاد یعنی اللہ کی توحید،اس اکیلے کی عبادت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی لازمی اتباع ہے اور جبکہ علم کلام والوں کی معرفت اور اس معرفت تک پہنچانے والی نظر کسی مسلمان پر فرض نہیں ہے نہ پہلی ذمہ داری ہے اس کی نہ آخری۔انہوں نے معرفت کو اس لیے لازمی قرار دیا کہ انہوں نے اپنے بنائے ہوئے اصولوں کا نام اصول دین رکھا ہے اور یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ دین کے اصولوں کا جاننا ہر مسلمان کیلئے ضروری ہے تاکہ اس کا اسلام صحیح رہے۔اسلام کے جو اصول ہیں وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے وضاحت سے بیان کر دیئے ہیں اب متکلمین کے بیان کی ضرورت باقی نہیں رہی یہی وجہ ہے کہ اہل کلام میں سے اشاعرہ وغیرہ نے اس بات کا اعتراف کیا کہ علم کلام کا طریقہ رسولوں اور ان کے متبعین اور سلف امت اور ائمہ کا طریقہ نہیں ہے بلکہ ان سلف وائمہ کے نزدیک یہ طریقہ حرام ہے محققین کے نزدیک تو یہ طریقہ ہے ہی باطل۔(فتاویٰ ابن تیمیہؒ: ۳/۳۰۳)

④ اہل سنت کے پاس علم کلام کو ردّ کرنے کی تیسری وجہ یہ ہے کہ اس میں عقل کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے اسے ہی حاکم تسلیم کیا جاتا ہے عقل کو کسی صورت میں محکوم نہیں بنایا جاتا۔علم کلام والوں نے عقل کو اتنی اہمیت دی اور اس کے احکام کو اتنا پسند کیا کہ جس مسئلہ میں عقل کو حاکم نہیں ہونا چاہیے تھا ان میں بھی اسے حاکم بنایا وہ اس طرح کہ یہ لوگ پہلے ایک مسئلہ سامنے لاتے ہیں پھر اسے عقل پر پیش کرتے ہیں پھر اس کیلئے دلائل جمع کرتے ہیں جو بھی دلائل عقل کو پسند آئیں اور کسی بھی طرح وہ مسئلہ ثابت ہو جائے۔اور جب عقل کسی نتیجے پر پہنچتی ہے اور ایسے مقام پر پہنچ جاتی ہے جہاں منقولہ دلائل پر اعتماد کیا جاسکتا ہو تو اس کو چھوڑ دیا جاتا ہے اور ایسے نتیجے پر پہنچتے ہیں جو منقولہ دلیل کے موافق نہ ہوں اگرچہ وہ منقولہ دلیل قرآن کی آیت ہی کیوں نہ ہو کبھی یہ لوگ حدیث کو بھی عقل کے معارض ہونے کی بنا پر ردّ کر دیتے ہیں یا اس بنیاد پر حدیث کو ردّ کرتے ہیں کہ حدیث کی بنیاد ظن پر ہے۔حدیث کے بارے میں ان کا نظریہ خبر واحد سے متعلق ان کی آراء سے واضح ہو جاتا ہے کہ انہوں نے اعتقادی مسائل میں مطلق خبر واحد کی حجیت کا انکار کیا ہے اور اعمال کے بارے میں خبر واحد کو قبول کرنے کیلئے کچھ شرائط رکھی ہیں کہ اس کا متن ایسا ہو جسے عقل صحیح سمجھتی ہو اگر کوئی راوی ایسی روایت کو بیان کرے جسے عقل محال سمجھتی ہو اور اس کی کوئی صحیح تاویل بھی نہ ہو سکتی ہو تو ایسی روایت مردود ہوگی نا قابل قبول ہوگی!!

(مختصر الصواعق للرازی:۱/۲۵۲،۲۵٦)

اس طریقے پر حدیثیں ردّ کرنے میں ان کا کردار کتنا بڑا شرمناک ہے اس تفصیل کیلئے ابن قتیبہ کی کتاب تاویل مختلف الحدیث ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔اس طریقے کو اپنانے میں کبّار اشاعرہ نے معتزلہ کی موافقت کی ہے وہ بھی کہتے ہیں کہ یقینی علم صرف عقل سے ثابت ہوتا ہے اور اگر تعارض ہو جائے (منقول ومعقول میں) تو عقل پر اعتماد کیا جائے گا جیسا کہ فخر الدین رازی کی کتاب مختصر الصواعق میں مذکور ہے کہ مقاصد تین ہیں۔(جن پر بحث کی جائے گی)

❶ وہ امور ہیں کہ شریعت کے ثبوت کا مدار اس کے ثبوت پر ہو جیسا کہ اللہ کا وجود اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیّت،ان دونوں باتوں کا شریعت کے خبر دینے سے

ثابت کرنا ممکن نہیں ہے۔

❷ اس چیز کو ثابت ماننا جس کے امکان کو عقل ثابت کرے اور اس چیز کی نفی کرنا جس کے امکان کی نفی عقل کرے۔ایسی چیز کو جب انسان خود نہیں پا سکتا یا اپنے حواس کے ذریعے سے اس کا ادراک نہیں کر سکتا تو اس کی معلومات شریعت کے علاوہ کسی اور طریقے سے حاصل نہیں ہوسکتیں۔

❸ وجوب الواجبات، امکان الممکنات، استحالة المستحيلات ،یعنی جن چیزوں کا وجود لازمی ہے جن کے وجود کا امکان ہے اور جن چیزوں کا وجود محال ہے۔ایسی تمام اشیاء کا علم عقل کے ذریعے ہی آسانی سے حاصل ہوسکتا ہے شریعت کی رو سے ان امور کا علم مشکل ہے اس لیے کہ اگر ان چیزوں کے بارے میں شریعت کی دی ہوئی خبر عقل کے مطابق ہوگی تو اعتماد عقل پر ہی کیا جائے گا شریعت کی خبر اضافی بات ہوگی اور اگر شریعت کی خبر ان امور میں عقل کے خلاف ہوئی تو عقل کو مقدم کرنا واجب وضروری ہوگا اور شریعت کی خبر کی تاویل کی جائے گی یہی محققین کا قول ہے!!! (مختصر الصواعق للرازي:١/ ٢٥٢، ٢٥٦)

عضدایجی ''المواقف'' میں کہتے ہیں: اگر عقلی دلیل شرعی دلیل کے معارض ہوئی تو عقلی کو لازماً نقلی پر مقدم کیا جائے گا۔(القائدالي معرفة العقائد:١٦٣)

ان لوگوں کا یہ خیال ہے کہ قطعی عقلی اور صحیح نقلی دلیل میں تعارض ہوسکتا ہے ان کا شاید یہ بھی خیال ہے کہ دلیل نقلی دلیل عقلی کو متضمن نہیں ہوتی حالانکہ قرآن کریم میں ایسی بہت سی مثالیں اور عقلی قیاسات موجود ہیں دوسری بات یہ ہے کہ کتاب وسنت کے نصوص کس طرح عقل کے خلاف ہوسکتے ہیں؟ جبکہ یہ دونوں اللہ کی طرف سے ہیں عقل بھی اللہ نے دی ہے شریعت بھی اسی نے نازل کی ہے لہٰذا دونوں میں تعارض نہیں ہوسکتا۔مگر یہ تب ہی صحیح ہوگا جب عقل سے مراد وہ عقل نہیں لی جائے جو تمام انسانوں میں مشترک ہے جسے عقل بدیہی کہتے ہیں کسی فلاں اور فلاں شخص کی عقل مراد نہ ہو جبکہ علم کلام والے صرف کسی اپنے اپنے اکابر میں سے ایک شخص کی عقل کو ہی فیصلہ کے قابل سمجھتے ہیں اسی لیے تو ان کے مذاہب کی جزئیات میں بہت زیادہ آپس میں اختلافات پائے جاتے ہیں۔آپس میں اتنے الجھ گئے ہیں کہ ایک دوسرے کو کافر تک قرار دے چکے ہیں خاص کر معتزلہ۔

ابن قتیبہ ''تاویل مختلف الحدیث'' میں کہتے ہیں: اگر ان لوگوں کا آپس کا اختلاف فروعات اور سنتوں میں ہوتا تو پھر بھی گنجائش ہوسکتی تھی اور ہم ان کا عذر قبول کر لیتے (اگر چہ ان کا جو دعویٰ اپنے بارے میں ہے وہ تو اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ان کا کوئی عذر قبول نہ کیا جائے) لیکن ان میں تو اختلاف توحید کے بارے میں بھی ہے، اللہ کی صفات اور قدرت کے بارے میں بھی اختلاف ہے، جنت کی نعمتوں اور اہل دوزخ کے عذاب میں اختلاف ہے اور ان امور میں بھی اختلاف ہے جن کا علم صرف ایک نبی کو اللہ وحی کے ذریعے دیتا ہے ان لوگوں نے ایک دوسرے کو کافر کہا اس کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

بغدادی نے نظام معتزلی کے بارے میں کہا ہے کہ اس کو معتزلہ کے اکثر شیوخ وعلماء نے کافر قرار دیا ہے۔مثلاً ابوالہذیل العلاف، جبائی اور اسکافی (نظام کا نام ابراہیم بن سیار البصری تھا (۲۲۱ھ) اعتزال کا علم اس نے ابوالہذیل العلاف سے حاصل کیا۔یہ جاحظ کا استاد تھا معتزلہ مذہب کے مشہور ترین افراد میں اس کا شمار ہوتا ہے یہاں تک کہ اس کے نام پر فرقہ نظامیہ بن چکا تھا۔) (طبقات الاصولين:١/ ١٤١ اور الفرق بغدادي:١٣١)

ابوالہذیل العلاف کے بارے میں معتزلہ کے مشہور عالم جعفر بن حرب نے کتاب لکھی ہے جس کا نام ''توبیخ ابی الہذیل'' تھا اس میں جعفر نے ابوالہذیل کو کافر قرار دیا (ابوالہذیل کا نام محمد بن الہذیل البصری تھا (۲۲۶ھ) اس نے اعتزال کا عقیدہ عثمان الطّویل سے لیا) اور اسی طرح بشر بن المعتمر کے بارے میں کہا کہ اس کے بھائی قدریہ ہیں اور ابوموسیٰ المردار کے بارے میں کہا کہ یہ معتزلہ کا راہب ہے۔اور اس کے اساتذہ نے اسے کافر قرار دیا ہے اور اس نے اپنے اساتذہ وشیوخ کو کافر قرار دیا ہے (بشر بن المعتمر بغداد کے معتزلہ کا سرغنہ تھا بہت بڑا شاعر بھی تھا) یہ تمام لوگ ایک دوسرے کو کافر ثابت کرنے میں مشغول رہتے تھے۔

اب آیئے دوبارہ اپنے مقصد کی طرف تو ہم عرض کرتے ہیں کہ عقل مصالح ومفاسد کا مکمل ادراک نہیں کر سکتی وہ مصالح ومفاسد جن کا تعلق انسانوں کے سیاسی ومعاشی امور سے ہوتا ہے اس کا تجربہ بارہا ہو بھی چکا ہے جب بھی دو نبیوں کے درمیان فترہ یعنی وقفہ کا دور آیا اور شریعت ختم ہوئی ہے تو اس دوران عقلاء نے انسانوں کیلئے قوانین ونظام وضع کیے ہیں مگر ان کی کوئی منظم بنیاد نہیں ہوتی تھی نہ ہی کوئی ایسا مضبوط قاعدہ وطریقہ ہوتا تھا کہ بعد میں آنے والی شریعت کے مطابق چل سکتا ہوتا بلکہ وہ چند امور کو اپنی دانست میں بہتر سمجھتے ہوتے تھے جن کی اچھائی کا فیصلہ عقل کر لیتی تھی مگر شریعت آنے کے بعد جب ان امور وقوانین کو جنہیں عقل بہتر قرار دے چکی ہوتی تھی شریعت کی روشنی میں پرکھا جاتا تو شریعت یا تو انہیں کلی طور پر مسترد کر دیتی یا ان میں ترمیم کرتی اس لیے کہ ان قوانین میں جہالت یا گمراہی یا حماقت یا دیگر غلطیاں پائی جاتیں اگر چہ وہ لوگ اپنی عقل سے بہت سے ایسے قوانین بھی بناتے کہ شریعت انہیں صحیح قرار دیتی اور انہیں برقرار رکھتی حالانکہ یہ قوانین وضع کرنے والے بہت

زیادہ عقلمند لوگ ہوتے تھے ان کی نظر بہت اعلیٰ ہوتی مگر اس کے باوجود وہ انسانوں کیلئے غلطیوں سے مبرا نظام وضع نہیں کر سکتے تھے یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ تنہا عقل انسانی معاشرے کے مسائل حل نہیں کر سکتی اگرچہ بہت سے کام صحیح بھی کرتی ہے مگر غلطیاں بھی ہوتی ہیں جبکہ شریعت ہر قسم کی غلطی سے مبرا ہوتی ہے۔ جب عقل کی یہ حالت ہے کہ وہ معاشرے میں پائے جانے والے آسان امور کا غلطی سے پاک حل پیش نہیں کر سکتی تو مشکل و پیچیدہ امور کا حل کیسے پیش کر سکتی ہے؟ یعنی یہ کہ اللہ کی صفات میں غور کرے، اللہ کی ذات میں فکر کرے اور اس کی ذات وصفات کو عقل سے سمجھنے و سمجھانے کی کوشش کرے؟ اور یہ فیصلہ کرے کہ کچھ کام اللہ پر واجب ہیں اور کچھ ایسے ہیں کہ اللہ ان کی قدرت نہیں رکھتا (نعوذ باللہ) وغیرہ وغیرہ۔ جبکہ شریعت نے اس مسئلے کو اس طرح حل کیا ہے کہ ہر قسم کی الجھن کو جڑ سے اکھیڑ دیا ہے اس لیے کہ شریعت کا علم عقل سے بہت آگے ہے۔ شریعت کی دی ہوئی خبروں کا احاطہ انسانی عقول کبھی نہیں کر سکتیں نہ ہی انسانی فکر اس کا احاطہ کر سکتی ہے۔ ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث شریف میں آتا ہے مخلوق میں غور وفکر کرو مگر خالق میں مت کرو۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اس کی وجہ بتاتے ہیں کہ اندازے لگانا یا غور وفکر کرنا وہاں ہوتا ہے جہاں قیاس ومثال کی گنجائش ہو اور قیاس ومثال کی گنجائش وہاں ہوتی ہے جہاں اشیاء باہم مشابہ ہوں اور یہ مشابہت مخلوق میں پائی جا سکتی ہے مگر خالق کی جہاں تک بات ہے نہ تو اس کے مشابہ کوئی ہے نہ کوئی نظیر ہے وہ صرف فطرت سے ہی معلوم ہے۔ (فتاویٰ ابن تیمیہؒ : ٤/٣٩-٤٠)

لہٰذا عقل پر اعتماد و بھروسہ کرنا، اس کے ان احکام اور مقرر کردہ پیمانوں کو قبول کرنا جن کا شریعت سے تعلق نہیں تو یہ روش انتہائی مہلک ہے اور یہ متشابہات کی پیروی ہے جس سے اللہ نے منع کیا ہے۔

⑤ اہل سنت کے پاس علم کلام کو ردّ کرنے کی پانچویں وجہ یہ ہے کہ جھگڑا و مقابلہ اور بحث وتکرار کو ہی اس علم میں دین کی تحقیق کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علم کلام کی بنیاد ہی اعتراضات، سوالات وجوابات پر ہے ان کا طریقہ بحث یہی ہے کہ اگر کوئی یہ سوال کرے تو ہم اس کا یہ جواب دیں۔ یعنی ان کی گفتگو کا آغاز ہی سوال اور جواب سے ہوتا ہے یہ ان کے مذہب کا خاصہ بن چکا ہے اسی پر ان کے اصولوں کی بنیاد ہے اس طریقہ کی وجہ سے اکثر ایسا ہوا ہے کہ جو جوابات لازم نہیں، ضروری نہیں اسے بھی ضروری قرار دیا گیا ہے اور اس طریقہ بحث نے بعض دفعہ وہ نتائج دیئے ہیں جو خود انہیں بھی پسند نہیں ہیں اگرچہ یہ لوگ ان نتائج کو فریق مخالف کے سامنے صرف اس وجہ سے تسلیم کر لیتے ہیں کہ فرار کا اور کوئی راستہ نہیں ہوتا جیسا کہ جبائی نے ایک نیا مذہب اختیار کیا جو پہلے کسی نے نہیں اپنایا تھا اور اللہ پر بہت بڑا جھوٹ باندھا کہ الوہیت کی حقیقت صرف یہ ہے کہ اللہ قدیم ہے صفات باری کی نفی بھی اس نے صرف اس وجہ سے کی تھی کہ اللہ کی ذات قدیم ہے اور اس کی قدامت اس کی خاص صفت ہے اور اگر کوئی صفت قدیم ثابت ہو جائے تو یہ اس کے قدیم ہونے کی ذاتی وصف میں جو خاص ترین وصف ہے شریک ہو جائے گی جب اس پر اعتراض کیا گیا کہ جب تم الٰہ کی قدامت مانتے ہو تو پھر کہو کہ الٰہ کی حقیقت صرف یہ ہے کہ وہ قدیم ہے اور الوہیت کی حقیقت صرف قدامت ہے تو اس نے اسی بات کو اپنا لیا اور کہا کہ الوہیت کی حقیقت قِدَم ہے!۔ (بدوی مذاهب الاسلاميين ١/٢٩٧)

اللہ تعالیٰ ظالموں کی ایسی باتوں سے بہت بلند و پاک ہے اس حقیر و ذلیل شخص کو کیا حق ہے کہ وہ الوہیت کی حقیقت ایسے دو لفظوں میں بیان کر دے جو اس نے اپنے فریق مخالف سے جان چھڑانے کیلئے استعمال کئے ہوں! اسی طرح ابو الہذیل العلاف کی باتیں ہیں کہ اس نے اللہ کی مقدورات کے فنا ہونے کی بات کی اور یہ کہا کہ اہل جنت و اہل جہنم بھی ایک حد تک جا کر رک جائیں گے (جہنم وجنت کا خاتمہ ہوگا) اپنی اس بات کی بنیاد اس قاعدے پر رکھی ہے کہ ہر حادث کی ایک انتہا ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی مقدورات مُحدَث ہیں ان کی بھی انتہا ہے، خیاط معتزلی نے ابو الہذیل کی اس بات کے جواز اور ابو الہذیل کیلئے عذر تراشنے کیلئے کہا تھا کہ ابو الہذیل نے یہ بات بحث میں اپنے فریق مخالف کے جواب میں کہی تھی۔ (المصدر السابق: ١/١٥٤ اور دیکھئے: فتاویٰ ابن تیمیہؒ : ٣/٣٠٤)

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ان لوگوں نے جو مسلک اختیار کیا ہے وہ اس شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالف ہے جس نے اس طرح کے جدلی اور باطل مناظرانہ طریقوں کو یکسر ختم کئے رکھا ہے بلکہ یہ بتلایا ہے کہ جو قومیں اس طرح کے بحث مباحثوں میں مبتلا ہو جائیں وہ بہت جلد ہلاک ہو جاتی ہیں۔ ابی امامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب بھی کوئی قوم ہدایت پانے کے بعد گمراہ ہوئی تو وہ آپس میں بحث وجدل کی وجہ سے ہوئی پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت تلاوت کی ﴿مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ﴾ (الزخرف:٥٨) انہوں نے آپ کے سامنے عیسیٰ علیہ السلام کا حال صرف جدل ہی کے لئے بیان کیا ہے بلکہ یہ تو جھگڑالو قوم ہے۔ (ترمذی، وقال حسن صحیح وصححه، الحاکم ووافقه الذهبی)

⑥ یہ لوگ شریعت کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں متکلمین معتزلہ شریعت کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اس کے احکام میں تعارض وتضاد ہے یہ لوگ پہلے اپنے

ذہن میں ایک مطلب یا ایک معنی ومسئلہ لاتے ہیں پھر جب کوئی صحیح حدیث آتی ہے جو اُنکے ذہنی مطلب ومسئلہ کے معارض ہوتو اس حدیث سے اس طرح بھاگتے ہیں جس طرح جذام زدہ شخص سے بھاگا جاتا ہے۔ان کی شدید خواہش ہوتی ہے کہ کاش یہ حدیث صحیح نہ ہوتی بلکہ یہ حدیث ہی نہ ہوتی،اپنے خودساختہ مسئلہ کے بارے میں جب کسی مخالف حدیث سے فرار کا کوئی راستہ انہیں دکھائی نہیں دیتا تو پھر اس کی تاویل کرنے لگ جاتے ہیں یا خبر واحد کہہ کر اسے ردّ کر دیتے ہیں اسی طرح اگر قرآنی آیت بھی ان کے مسائل کے خلاف ہوتو اس میں بھی تاویل کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر ایسا بہت کم ہوتا ہے۔جن احادیث کو ان لوگوں نے تعارض کا بہانہ بنا کر ردّ کر دیا وہ بے شمار ولا تعداد ہیں ان میں سے بہت سی احادیث ابن قتیبہ نے اپنی کتاب ''تاویل مختلف الحدیث''میں جمع کی ہیں اور ان میں دلالت کی وجہ بھی واضح کردی ہے ہم ان میں سے بطور مثال دو حدیثوں کو پیش کرتے ہیں۔

① معتزلہ کہتے ہیں کہ عقل وفکر نے جس حدیث کو مسترد کیا ہے وہ حدیث ہے،جس کی سند تم یوں بیان کرتے ہو کہ زہری نے ابوسلمہ سے پھر انہوں نے ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے اور انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان بیان کیا ہے۔

((انااحق بالشك من ابی ابراهيم ، ورحم الله لوطًا ان كان ليأوی الی ركن شديد ولو دعيت الی مادعی اليه يوسف لأجبت))

(صحيح بخاری:٣٣٧٢،احاديث الا نبيأباب قوله نبئهم عن ضيف ابراهيم،صحيح مسلم واحمد)

''میں اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی بنسبت شک کرنے کا زیادہ حق رکھتا ہوں۔اللہ لوط علیہ السلام پر رحم کرے وہ کسی مضبوط سہارے کی تلاش میں تھا (بقول معتزلہ حالانکہ اللہ کا سہارا انہیں حاصل تھا) اور یوسف علیہ السلام کو جس (جیل سے رہائی) کی دعوت دی گئی تھی اگر مجھے دعوت دیجاتی تو میں قبول کر لیتا''

معتزلہ کہتے ہیں:کہ اس حدیث میں ابراہیم،لوط اور یوسف علیہم السلام پر الزام لگایا گیا ہے اور ان پر عیب لگایا گیا ہے۔ابومحمد ابن قتیبہ نے معتزلہ کی بات کا جواب اور اس حدیث کا حل پیش کیا ہے وہ کہتے ہیں۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ 0(البقرة:٢٦٠)

''جب ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا اے رب! تو کس طرح مردوں کو زندہ کرتا ہے؟ اللہ نے فرمایا کیا تجھے یقین نہیں (ایمان نہیں)؟ کہا! کیوں نہیں لیکن تاکہ میرا دل مطمئن ہو جائے''

جب یہ آیت نازل ہوئی تو ایک قوم نے کہا کہ ابراہیم علیہ السلام نے شک کیا مگر ہمارے نبی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے تو شک نہیں کیا تو ان کے جواب میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ شک کرنے کا حق رکھتا ہوں (یا مستحق ہوں) یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عاجزی کے طور پر کہا تھا اور ابراہیم علیہ السلام کی قدر ومنزلت اجاگر کرنے کیلئے کہا تھا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مطلب تو اضع تھی کہ ہم ابراہیم علیہ السلام سے افضلیت میں کمتر ہیں مگر ہم شک نہیں کر رہے تو انہوں نے کیسے اِحیاءِ موتٰی کا مشاہداتی مطالبہ بطورِ شک کیا ہوگا؟!۔(تاويل مختلف الحديث:٦٥)

② انہوں نے کہا:دوسری حدیث قرآن اور عقل کو جھٹلانے والی تشبیہ دینے والی وہ حدیث ہے جس کو اے اہل سنّت! تم بیان کرتے ہو۔((ان قلب المؤمن بين اصبعين من اصابع الله)) ''مومن کا دل اللہ کی دو انگلیوں کے درمیان ہے۔''معتزلہ کہتے ہیں اگر اس حدیث میں تم انگلیوں سے مراد اللہ کی نعمتیں مراد لو تو پھر حدیث صحیح ہے اور ہمارا بھی یہی مذہب ہے اور اگر تم حقیقی انگلیاں مراد لیتے ہو تو یہ ناممکن ہے اس لیے کہ اللہ کو اعضاء کے ساتھ موصوف نہیں کیا جاتا۔ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے اس کا جواب دیا ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ حدیث صحیح ہے البتہ معتزلہ نے انگلیوں سے مراد نعمتیں لے کر حدیث کی بے جا تاویل کی ہے جو صحیح نہیں ہے اس لیے کہ دوسری حدیث میں آتا ہے کہ اللہ زمین کو ایک انگلی پر اٹھائے گا اسی طرح دو انگلیوں پر۔ہم یہ نہیں کہتے کہ اس کی انگلیاں ہماری انگلیوں کی طرح ہیں یا اس کے ہاتھ ہمارے ہاتھوں کی طرح ہیں اس کی مٹھی ہماری مٹھی کی طرح ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی بھی چیز ہماری کسی چیز سے مشابہت نہیں رکھتی۔(تاويل مختلف الحديث:٦٤١)

امام شاطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ شریعت کا علم حاصل کرنے والے،اس کے مسائل میں غور وفکر کرنے اور اس کے حقائق کو جاننے والے کیلئے ضروری ہے کہ شریعت کو اس نظر سے دیکھے کہ یہ مکمل ہے نہ اس نظر سے کہ یہ ناقص ہے۔عبادات اور عادات میں شریعت کو مکمل سمجھے اس سے باہر نکلنے کی کوشش نہ کرے کسی بھی صورت میں،اس لیے کہ

شریعت سے خروج گمراہی ہے، اندھیرے میں ٹامک ٹویاں مارنا ہے حالانکہ شریعت کی تکمیل واتمام ثابت ہے۔ اب اس میں کمی بیشی کرنے والا بدعتی ہے صحیح راستہ کو چھوڑ کر پگڈنڈیوں پر چلنے والا ہے۔ اسی طرح یہ بھی یقین رکھنا ضروری ہے کہ قرآنی آیات اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ نہ ہی قرآنی آیات ایک دوسرے کے معارض ہیں نہ ہی احادیث باہم متعارض ہیں۔ بلکہ سب کے سب ایک ہی راستے پر رواں دواں ہیں۔ اگر کسی مسلمان متبع شریعت کو بظاہر ان میں کوئی تعارض نظر آجائے تو اسے چاہیے کہ وہ یہ عقیدہ رکھے کہ ان میں کسی قسم کا اختلاف نہیں ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے خود گواہی دی ہے کہ اس میں اختلاف نہیں ہے لہٰذا کوشش یہ کرنی چاہیے کہ ان میں تطبیق پیدا کی جائے یا بغیر کسی اعتراض کے انہیں تسلیم کرلے۔ (الاعتصام: ۲/ ۳۱۰)

اسلامی زندگی پر علم کلام کے اثرات

اگر ہم وہ نقصانات شمار کرنا چاہیں جو علم کلام نے اسلامی زندگی کو پہنچائے ہیں تو انہیں شمار کرنا ممکن نہیں ہے۔ اگر انتہائی اختصار سے کام لیں پھر بھی ان نقصانات کو گنوا نہیں سکتے البتہ ان کے مسائل سے ہم چند مثالیں اور نمونے پیش کرکے ان کے علماء کے اقوال اور ان کے عقائد کے نتائج کا اندازہ لگا سکتے ہیں اور قارئین سمجھ جائیں گے کہ ہم اس علم کی طرف کیوں مائل نہیں ہیں قارئین یہ بھی اندازہ کرلیں گے کہ یہ علم اتنا پیچیدہ اور مغلق ہے کہ اپنے ماننے اور جاننے والوں کیلئے بھی مشکل بن گیا ہے۔ نمونے کے طور پر پہلے ملاحظہ کریں متکلمین اشاعرہ کا قدرت الٰہیہ سے متعلق کلام۔ جوھرۃ التوحید کا شارح لکھتا ہے قدرت کے سات تعلقات ہیں ان میں سے ایک صلوحی قدیم ہے۔ صلوحی کا معنی ہے کہ قدرت کی ازلی صلاحیت جو ایجاد واعدام کی ہے باقی چھ تعلقات حسب ذیل ہیں:

① **تعلق قبضہ**۔ جو ہمارے عدم کے ساتھ ہمارے وجود سے قبل رہا ہے۔

② **تعلق بالفعل**۔ سابقہ عدم کے بعد ہم کو بالفعل وجود میں لانا۔

③ **تعلق قبضہ**۔ عدم سے وجود میں لانے کے بعد وجود کو برقرار رکھنا۔

④ **تعلق بالفعل**۔ وجود کے بعد بالفعل عدم میں لیجانا۔

⑤ **تعلق قبضہ**۔ وجود کے بعد عدم کو برقرار رکھنا۔

⑥ **تعلق بالفعل**۔ قیامت میں اٹھائے جاتے وقت ہمیں بالفعل وجود بخشنا۔

تعلق کا معنی ہے کسی صفت کا قائم بالذات ہونے کیلئے امر زائد کو طلب کرنا۔ (شرح الجوھرۃ للباجوری / ۱۰۰)

پھر دسوقی اس مسئلے کی مزید شرح اور وضاحت!! کرتے ہوئے کہتا ہے۔ قدرت کا تعلق اتفاقی طور پر ممکن الوجود کے ساتھ تاثیری تعلق ہے اسی طرح نہ آنے والے کے ساتھ بھی اس کا تعلق تاثیری ہے! (حاشیة دسوقی علی أم البراھین: ۱۰۰)

سمع وبصر کے تعلقات کے بارے میں ان کا قول ملاحظہ فرمائیں سمع وبصر کے تین تعلقات ہیں:

❶ **خلوصی قدیم**: وہ ازلی صلاحیت جس نے کائنات کے ذرات اور ان کی صفات کو آشکارا کیا جو کہ سمع وبصر میں ہمیشہ رہنے والی ہیں!۔

❷ **تجیزی قدیم**: ذات عالی اور اس کی صفات کا سمع وبصر میں انکشاف ایسا انکشاف جو علم کے انکشاف کے علاوہ ہے (انکشاف اور علم کو اس لیے الگ کیا گیا ہے کہ) ہر صفت کی ایک حقیقت ہوتی ہے جو دوسری حقیقت سے متغائر والگ ہوتی ہے۔ البتہ ان حقائق کا تعلق امور عدمیہ جیسے سلوب اور امور ثبوتیہ جیسے احوال کے ساتھ نہیں ہوتا۔

❸ **تجیزی حادث**: ممکنات کا انکشاف ان دونوں کا سمع وبصر میں وجود کے بعد۔ شرح الجوھرۃ، باجوری کا اس پیچیدہ اور مشکل ترین انداز بیاں کو ملاحظہ کریں جو اللہ کی صفات بیان کرنے کیلئے اختیار کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ اللہ ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان کردہ اللہ کی صفات کو موازنہ کرے خود ہی اندازہ ہو جائے گا مثلاً۔ ایک مرتبہ لوگ بلند آواز سے اللہ کو پکار رہے تھے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوگو خود پر رحم کرو (خود کو آرام پہنچاؤ) تم کسی بہرے یا غائب ذات کو نہیں پکار رہے ہو جس کو تم پکار رہے ہو وہ سننے والا قریب ہے۔ (صحیح بخاری: ٦٣٨٤، الدعوات باب الدعاء اذا علا عقبة)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی صفات کتنے سادہ اور آسان انداز سے بیان کردی تجیزی اور صلوحی انداز اختیار کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔

علم کلام کن مراحل سے گذرا ہے؟

علم کلام چار مختلف مراحل سے گذرا ہے ان مراحل میں اس علم کے مباحث کے موضوعات تبدیل ہوتے رہتے ہیں ہم اختصار کے ساتھ یہ مراحل وادوار پیش کررہے ہیں۔

❶ پہلا دور متقدمین متکلمین کا دور مثلاً واصل بن عطاء (۱۳۰ھ) عمرو بن عبید (۱۴۳ھ) خالد بن صفوان اور ابوالہذیل العلاف (۲۳۵ھ) ابراہیم النظام (۲۳۰ھ) یہ دور اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ یہ یونانی اصطلاحات سے متاثر ہے خصوصاً علاف کا دور کہ جب یونانی فلسفہ کی کتابوں کے ترجمے ہوئے مثلاً کتاب ''الطبیعۃ'' اور ''مابعدالطبیعۃ'' جو ارسطو کی کتابیں تھیں اور اسحاق کندی نے ان کا ترجمہ کیا۔(مذاهب الاسلاميين :۱۸٤)

اس دور میں علم کلام کے موضوعات بکھرے ہوئے تھے یعنی کسی قاعدے یا اصول کے وضع کیے بغیر کبھی بھی کہیں بھی کسی بھی مسئلہ پر بحث شروع ہو جاتی اسی طرح اس دور میں یہ علم ارسطو کے علم منطق کی معاونت سے بھی خالی تھا۔(القنو جی،أبجد العلوم:۲/٤٥٠)

❷ دوسرا دور: یہ وہ دور ہے جب علم کلام کے اس معرکہ میں اشاعرہ بھی معتزلہ کے مقابل آ گئے اشاعرہ میں ابوالحسن اشعری (۳۳۰ھ) جو اشاعرہ مذہب کا بانی تھا۔ابوبکر باقلانی (۴۰۲ھ) اس نے علم کلام کے وہ قواعد وضع کئے جو علم کلام پڑھنے والوں کی ضرورت ہیں مثلاً جوہر فرد کا ثبوت اور یہ کہ عرض،عرض کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتا۔ان کے بعد امام الحرمین ابوالمعالی الجوینی (۴۷۸ھ) ہیں انہوں نے اس بارے میں کتاب لکھی جس کا نام الشامل ہے پھر اس کا اختصار ''الارشاد'' کے نام سے کیا۔معتزلہ میں سے اس دور کے عالم تھے ابوہاشم الجبائی (۳۲۰ھ) ان کے بعد ابوعبداللہ البصری پھر قاضی عبدالجبار (۴۱۵ھ)۔

❸ تیسرا دور: اس دور کے بہترین عالم ابوحامد الغزالی (۵۰۵ھ) ہیں پھر فخرالدین رازی ہیں۔یہ دور فلاسفہ کے کلام میں مناقشہ ومباحثہ کے لحاظ سے اور علم کلام میں فلاسفہ کے اقوال داخل کرنے کے لحاظ سے ممتاز دور ہے۔

ابجد العلوم کے مصنف فرماتے ہیں:ان علماء نے متقدمین علماء کے قواعد واصول میں غور وفکر کیا تو دلائل کی بنیاد پر ان میں سے بہت سے قواعد سے اختلاف کیا۔یہ بھی انہوں نے پتہ لگا لیا کہ متقدمین کے اقوال زیادہ تر فلاسفہ کے کلام سے ماخوذ ہیں خصوصاً طبیعیات اور الہیات میں۔(ابجد العلوم:٤٥١) جس طرح کہ یہ بعد کا دور پہلے دور سے اس لحاظ سے بھی امتیاز رکھتا ہے کہ اس میں علم کلام کے مقدمات اور اس کے ادلّہ اور اُس کے براہین میں ارسطو کی منطق کو استعمال کیا گیا سب سے پہلے امام الغزالی نے ارسطو کی منطق کو علم کلام میں داخل کیا۔(صون المنطوق والكلام للسيوطى:١٢)

❹ چوتھا دور: البیضاوی (۶۹۱ھ) جس نے ''الطّوالع کتاب'' لکھی ہے ان کے بعد دیگر علماء بھی ہیں یہ دور اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ اس میں علم کلام اور فلسفی مذاہب باہم ایسے مختلط ہوئے کہ ان دونوں میں تمیز کرنا لکھنے اور پڑھنے والے پر مشکل ہو گیا۔ان کے بعد جو لوگ آئے وہ صرف مقلد تھے جو اشاعرہ فرقہ سے تعلق رکھتے تھے۔اشاعرہ میں سے علم کلام کے جو بڑے عالم تھے وہ عوام میں علم کلام کی اشاعت اور اسے عام کرنے سے منع کرتے تھے ان کا خیال تھا کہ یہ علم صرف خواص تک محدود رہنا چاہیے یا جو شخص علم دین میں بہت زیادہ مہارت حاصل کرنا چاہے اس کو یہ علم سیکھنا چاہیے۔ہمارے خیال میں ان کا یہ قول صرف ردّ عمل تھا اس بات کا کہ اس علم کی اشاعت سے لوگوں کے عقیدے پر برے اثرات مرتب ہوئے اور عقیدہ،ایمان اور قرآن سے متاثر ہونے میں خاص اسلوب اپنانے کی وجہ سے اور لوگوں کے ذہنوں میں اس علم کے خلط ملط ہونے کی وجہ سے اور مطالب میں اضطراب اور پیچیدگی کی وجہ سے جن علماء نے اس علم کو عوام میں پھیلانے سے منع کیا ہے ان میں ابوالمعالی الجوینی ہیں انہوں نے اپنی کتاب الغیاثی میں لکھا ہے کہ جو شخص (علمی لحاظ سے) عوامی سطح سے بلند ہونا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ علم کلام کی کتابیں پڑھے جہاں تک عوام کا تعلق ہے تو امام المسلمین کو چاہیے کہ انہیں سلف کے عقیدے پر مجتمع ومتفق رکھے اور انہیں بھول بھلیوں میں جانے سے روکے۔

(الغياثى لابى المعالى الجوينى :١٩٠)

ان کے شاگرد الغزالی نے بھی اس رائے میں ان کی تائید کی ہے جیسا کہ اپنی کتاب ''الجام العوام عن علم الکلام'' میں لکھ چکے ہیں۔

سلف صالحین نے علم کلام کی مذمت کی ہے

امت کے سلف صالحین اور ائمہ عظام نے علم کلام کی مذمت کی ہے اور انتہائی سختی سے اس میں گھسنے سے منع کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس علم سے نفرت کرتے تھے

اوراس کے حصول کی اجازت نہیں دیتے تھے اس وجہ سے کہ نہ تو یہ علم کسی تشنگی علم رکھنے والے کو سیراب کرتا ہے اور نہ جہالت سے بیمار انسان کو شفاء دیتا ہے۔امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:شرک کے علاوہ اللہ کے حرام کردہ کسی بھی کام کا ارتکاب علم کلام میں غور کرنے سے بہتر ہے۔فرماتے ہیں کہ علمائے کلام کے بارے میں میرا فتوی یہ ہے کہ انہیں چھڑی سے مارا جائے پھر انہیں لوگوں میں گھمایا پھرایا جائے اس اعلان کے ساتھ کہ یہ سزا ہے ان لوگوں کی جو کتاب وسنت کو چھوڑ کر علم کلام کو اپنائے ہوئے ہیں۔

(تلبیس ابلیس،ابن جوزی:۸۲)

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں:علم کلام کا حامل کبھی بھی صحیح راستے پر نہیں آسکتا علمائے کلام زندیق ہیں۔(المصدر السابق:۸۳)

امام اوزاعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کے ساتھ برائی کا ارادہ کرتا ہے تو ان کو جدل ومباحثوں میں مبتلا کردیتا ہے اور عمل سے روک دیتا ہے۔(شرح اصول اعتقاداهل السنة اللا لكائى:۱/۱٤٥)

ابو یوسف رحمہ اللہ سے مروی ہے:جس نے کیمیا کے ذریعے مال کمانے کی کوشش کی وہ مفلس ہوگیا جس نے علم کلام کے ذریعے دین حاصل کرنے کی کوشش کی وہ زندیق بن گیا۔(المصدر السابق:۱/۱٤٧،صون المنطوق والكلام للسيوطى)

اسی طرح کے اقوال ابن مدینی،ابوزرعہ،ابی حاتم الرازی،اسحاق بن ابراہیم،قاسم بن سلام،لیث بن سعد،مالک،سفیان ثوری رحمہم اللہ وغیرہ سے بھی منقول ہیں یہ سب امت کے جلیل القدر ائمہ اور علماء متکلمین کی کتابیں پڑھنے سے منع کرتے تھے ان کی محافل ومجالس میں شرکت سے اور متکلمین سے میل جول رکھنے روکتے تھے۔(شرح اصول اعتقاد اهل السنة:۱/۱٥۱)

بہت سے متکلمین کے گروہوں نے حق کی طرف رجوع کیا

اللہ کی صفات کو ثابت کرنے اور دیگر معاملات میں متکلمین کے کئی ائمہ نے اپنے نظریات سے رجوع کرکے سلف صالحین کا عقیدہ اختیار کیا اور عقائد کی باریکیوں میں جو مباحث یہ پہلے کرچکے تھے ان سے لوگوں کو منع کیا،ان سے توبہ اور رجوع کا اعلان کیا فخر الدین رازی کی جو وصیت کتاب ''عیون الأ نباء''میں درج ہے اس میں فرماتے ہیں:میں نے علم کلام کے طرق آزمالیے اور انہیں جانچ لیا اور فلاسفہ کے مناہج بھی دیکھ لیے مگر میں نے اس میں وہ فائدہ نہیں پایا جو قرآن عظیم میں پایا ہے اس لیے کہ قرآن عظیم یہ کوشش کرتا ہے کہ عظمت وجلالت کو مکمل طور پر اللہ کیلئے ثابت کیا جائے اور اس بارے میں معارضات ومناقضات کو وارد کرنے میں گہرائی میں جانے سے روکتا ہے۔اس لیے میں کہتا ہوں کہ جس کے وجود کا وجوب،اس کی وحدانیت،شرکاء سے جس کی براءت،قدم اور ازلیت اور تدبیر وفعالیت میں دلائل ظاہرہ سے ثابت ہو اس کا اقرار کرتا ہوں اور اسی عقیدے پر اللہ کے سامنے جاؤں گا اور جو اس طرح نہ ہو(یعنی میرے خیال میں تو اللہ کی صفات اسی طرح ہیں اور انہیں ماننی چاہئیں مگر ہمارا علم اللہ کی صفات کے بارے میں ناقص ہے لہٰذا اگر اس طرح نہ ہوں جس طرح میں سمجھا ہوں تو پھر بھی میں علم کلام کا سہارا نہیں لوں گا بلکہ کہوں گا)میرا دین محمد سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع ہے۔(عن القائد الى تصحيح العقائد:۷٤)

فخر الدین رازی نے توبہ،رجوع اور پشیمانی کا اظہار اپنی زندگی میں کردیا تھا اس بارے میں ان کے چند اشعار ہیں جن کا مفہوم کچھ اس طرح ہے:

عقلوں کو ہر وقت آگے رکھنے کی انتہاء الجھاؤ ہے اور اکثر لوگوں کی کوششوں کا نتیجہ گمراہی ہے اور ہماری روحیں ہمارے جسموں سے وحشت اور گھبراہٹ میں ہیں اور ہماری دنیا کا حاصل تکلیف اور وبال ہے۔ہم اپنی بحث وتحقیق سے پوری زندگی کوئی فائدہ نہ اٹھاسکے سوائے اس کہ ہم قیل وقال میں عمریں گذار گئے۔

مزید فرماتے ہیں:میں نے ان(علم کلام کے)تمام مسائل کو دیکھ لیا ہے اور اس کے قواعد میں بھی نظر دوڑائی ہے۔میں نے صرف یہ دیکھا ہے کہ(اس کا عالم وحامل)حیرانی سے اپنی ٹھوڑی پر ہتھیلی رکھے ہوئے ہوتا ہے یا حسرت سے گذری ہوئی عمر کو دستک دیتا ہے۔

(ايثار الحق على الخلق:۸)

ابن الصلاح کہتے ہیں:کہ مجھے قطب طوغائی نے دومرتبہ بتایا کہ اس نے فخر الدین رازی کو کہتے ہوئے سنا تھا کہ کاش میں علم کلام میں مشغول نہ ہوا ہوتا یہ کہہ کر فخر الدین رازی رونے لگ جاتے۔(مقدمة اعتقادات فرق المسلمين والمشركين للرازى:۲۳)

فخر الدین رازی نے اپنے شاگرد ابراہیم بن ابی بکر الاصفہانی کو وصیت کی تھی کہ:

اس شخص کے انجام سے عبرت حاصل کرو جو علم کلام کی بھول بھلیوں میں مشغول رہا (فخر الدین رازی اپنی بات کر رہے ہیں) اگر اس کو اللہ کی رحمت نہ تھام چکی ہوتی تو وہ ہلاک ہو چکا ہوتا اور فرمایا: یاد رکھو کہ میں علم سے محبت کرنے والا آدمی تھا میں ہر علم کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھتا تھا اس کی کیفیت اور کمیّت کے بارے میں خواہ وہ حق ہوتا یا باطل، مفید ہوتا یا غیر مفید، پھر میں نے علم کلام کے قواعد اور فلسفہ کے مناہج اور طریقے بھی آزما لیے مگر اس میں مجھے وہ فائدہ نظر نہیں آیا جو قرآن عظیم میں مجھے ملا، اس لیے کہ قرآن عظیم ہر قسم کی عظمت وجلالت مکمل طور پر اللہ کیلئے ثابت کرتا ہے اور معارضات ومناقضات پیش کرنے سے منع کرتا ہے علم کلام اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ انسانی عقول سرگرداں رہیں اور اس کے تنگ اور دشوار راستوں اور پوشیدہ مناہج اور طریقوں میں چلتے چلتے کمزور ہو جائیں۔ (عیون الأنباء: ۲/۲۶)

یہ ہے علم کلام کے بارے میں اشاعرہ کے غیر متنازع عالم کی رائے اور ایسے شخص کی رائے جس کے اقوال پر متکلمین کے مذہب کی بنیاد قائم ہے۔ احمد بن سنان کے بارے میں آتا ہے انہوں نے کہا کہ ولید بن ابان الکرابیسی بہت بڑا عالم اور سمجھدار آدمی تھا جب ان کی وفات کا وقت قریب آیا تو اس نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ:

کیا مجھ سے بڑا کوئی علم کلام کا عالم ہے؟ انہوں نے کہا نہیں۔ تو اس نے کہا: کیا تم مجھے الزام دو گے؟ برا سمجھو گے؟ انہوں نے کہا نہیں؟ تو اس نے کہا: میں تمہیں وصیت کرتا ہوں تم اسے مانو گے؟ انہوں نے کہا ضرور مانیں گے۔ اس نے کہا: تم محدثین کے راستے کو اپنائے رکھو کیونکہ میں نے حق انہیں کے پاس دیکھا ہے۔ (تلبیس ابلیس: ۸٤)

ابو المعالی الجوینی کہتے تھے: میں نے اہل اسلام اور ان کے علوم کو اچھی طرح پرکھا ہے میں نے بہت زیادہ علم بھی حاصل کیا ہے اور اس علم میں بھی طبع آزمائی کی ہے جس سے لوگوں نے منع کیا تھا یہ سب کچھ میں نے حق کی تلاش اور تقلید سے فرار کیلئے کیا تھا اب میں ان تمام سے رجوع کر کے حق کی طرف لوٹ آیا ہوں تم بھی اسلاف کے دین کو اپناؤ اگر مجھے اپنی تحقیق کے نتیجے میں حق نہ ملا تو میں اسلاف کے دین پر مروں گا۔ اور میرا خاتمہ کلمۂ اخلاص پر ہوگا۔ ارے ابن جوینی پر افسوس! (کہ زندگی کا پیشتر حصّہ گنوا دیا) اور اپنے ساتھیوں سے کہتا تھا میرے ساتھیو! علم کلام میں مشغول مت ہونا اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہ علم مجھے وہاں پہنچائے گا جہاں پہنچا چکا ہے تو میں کبھی اس میں مشغول نہ ہوتا۔ (تلبیس ابلیس: ۸۵)

ابو حامد الغزالی کو بھی علم کلام میں کوئی فائدہ نظر نہ آیا تو انہوں نے بھی آخری عمر میں رجوع کر لیا وہ اور فائدہ نہ پانے ہی کی بناء پر اپنی آخری عمر میں علم کلام سے رجوع کر کے اس علم کی طرف متوجہ ہوئے جس علم کو وہ اہمیت نہیں دیتے تھے اور سمجھ لیا کہ علم کلام میں کچھ بھی فائدہ نہیں۔ اور پھر حفظ قرآن، صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی طرف توجہ کی۔ کہا جاتا ہے کہ جب امام غزالی کا انتقال ہوا تو صحیح بخاری ان کے سینے پر رکھی ہوئی تھی مگر قرآن وحدیث کے اثرات ان کی کتابوں میں اس لیے نظر نہیں آئے کہ جب انہوں نے ان دونوں کی طرف رجوع کیا تو زندگی نے انہیں اتنی مہلت نہ دی کہ وہ قرآن وحدیث کی روشنی میں کچھ لکھ لیتے۔ (التفرقة بين الا يمان و الزندقة: ۷۹، ۸۳)

اس مذہب کے بانی ابوالحسن اشعری کے مقلدین اس بات کی طرف توجہ نہیں کر رہے نہ ہی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ امام اشعری نے بھی علم کلام کے منہج اور اشاعرہ کے عقائد سے رجوع کر لیا تھا اور اس بات کا اقرار کر لیا تھا کہ میں مذہب اہل سنت کی طرف اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی طرف خود کو منسوب کرتا ہوں (احمد بن حنبل رحمہ اللہ ہی اشعری کے زمانے میں اہلسنت کے امام تھے) امام اشعری نے اپنی آخری کتاب اس عقیدے کی حقیقت واضح کرنے کیلئے لکھی جس کا نام ''الابانۃ عن اصول الدیانۃ'' ہے۔

ان سطور میں ہم نے جتنے ائمہ کا ذکر کیا یہ سب کے سب اشاعرہ متکلمین کے بہت بڑے نامی گرامی امام ہیں ان سب نے علم کلام کے منہج سے توبہ کی اور اہل سنت کے مذہب کی طرف رجوع کیا۔ اگر علم کلام کا مذہب حق ہوتا تو یہ کبھی اسے نہ چھوڑتے اور اس کے نقائص وعیوب بیان نہ کرتے اور اپنی آخری عمر میں اس سے براءت کا اعلان نہ کرتے افسوس ان بدعتیوں پر خود کو ان ائمہ کی طرف منسوب کرتے ہیں، ان کی تقلید کا دعویٰ کرتے ہیں مگر ان کی آخری عمر کی حالت سے عبرت حاصل نہیں کرتے۔ جہاں تک معتزلہ متکلمین کا تعلق ہے تو ان میں سے کسی کے بارے میں معلوم نہ ہو سکا کہ اس نے توبہ کی ہو اور رجوع کیا ہو اس کی وجہ (مذہب کی حقانیت نہیں بلکہ) باطل مذہب میں غلو ہے اور ان میں صحیح مذہب کی جستجو بھی نہیں تھی وہ بدعت کے سرغنہ تھے بدعتیں ایجاد کرنے میں ہی مگن رہتے تھے۔ ہم یہ کتاب معتزلہ کے بارے میں لکھ رہے ہیں مگر طویل گفتگو علم کلام سے متعلق اس لیے کی کہ (جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں) کہ علم کلام کا آغاز اور اس کی ارتقاء معتزلہ کی وجہ سے ہوئی ہے ہمارے پاس علم کلام معتزلہ کی میراث کی صورت میں ہی باقی ہے اور جسے اشاعرہ نے نقل کیا انہوں نے بھی معتزلہ سے ہی اسے حاصل کیا اور عقیدہ سمجھنے اور ایک دوسرے

انداز سے عقیدہ کو پیش کرنے کیلئے اس علم کو کام میں لانا شروع کیا۔

دوسری فصل

معتزلہ کے عقائد

معتزلہ کے ائمہ وزعماء کا تقریباً اس بات پر اجماع ہو چکا ہے کہ اعتزال کے پانچ اصول ہیں جن کے گرد ان کے عقائد اور احکام گردش کرتے ہیں ہر اصول میں سے متعدد مسائل برآمد ہوتے ہیں ان کیلئے ضروری ہے اور ان کی عقل انہیں کہتی بھی ہے کہ وہ انہی اصولوں کے پیچھے چلتے رہیں اور ان نتائج کو لازم پکڑ لیں جو ان کی عقلیں انہیں دیتی ہیں۔

ان میں سب سے اہم اصول ہے صفات باری تعالیٰ کی نفی جسے یہ لوگ توحید کہتے ہیں جو استدلال عقلی انہوں نے کیا ہے اس کی رو سے اللہ کے وجود کیلئے صفات کی نفی لازمی ہے۔ ان کے اس عقیدے نے اُنہیں خلق قرآن کے نظریے پر آمادہ کیا اسی عقیدے نے ان کو یہ نظریہ دیا کہ مؤمنین قیامت کے دن اللہ کا دیدار نہیں کریں گے۔ اسی طرح اس عقیدے کی وجہ سے ہی انہوں نے اللہ کے استواء علی العرش کا انکار کیا ہے حالانکہ قرآن مجید میں اس کا واضح ذکر موجود ہے۔ اس عقیدے کی بنا پر انہوں نے وہ اسلامی عقیدہ مسترد کر دیا جو کتاب وسنت سے ثابت شدہ تھا جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ نے آگے منتقل کیا تھا، سلف صالحین نے جسے اپنایا تھا خصوصاً خیر القرون کے دور میں۔ ان اصولوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ تقدیر کی نفی کی جائے جسے یہ لوگ عدل کہتے ہیں۔ انہوں نے یہ اصول اپنے اس باطل قیاس سے لیا ہے کہ اللہ کے عدل کو انسان کے عدل پر قیاس کیا ہے اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ انہوں نے انسانوں کے افعال کو انہی کی تخلیق قرار دیا ہے (کہ انسان اپنے اعمال کا خود خالق ہے) یہ افعال اللہ کے پیدا کردہ نہیں ہیں بلکہ ان میں سے تو کچھ کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ اپنے بندوں کے افعال پیدا کرنے پر قادر ہی نہیں ہے۔ یہ بھی ان کا عقیدہ ہے کہ اللہ ظلم کرنے پر قادر نہیں ہے نہ ہی وہ ظلم کا ارادہ کرتا ہے نہ اسے پسند کرتا ہے اسی وجہ سے انہوں نے اللہ کیلئے یہ لازم کر دیا ہے کہ وہ وہی کام کرے جو بندوں کے مصلحت اور فائدے کے ہیں۔ اس طرح انسان شریعت کے بغیر ہی کسی چیز یا عمل کی اچھائی برائی اور خیر وشر ہونے کا فیصلہ محض عقل کی بنیاد پر کر سکتے ہیں اس لیے کہ اشیاء میں ذاتی خوبی وخرابی، خیر وشر، حسن وقبح موجود ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ انسانوں کو حساب دینا پڑتا ہے اپنے اعمال کا اور جزاء وسزاء بھی ملتی ہے چاہے ان افعال واعمال کے بارے میں شریعت کا کوئی حکم ہو یا نہ ہو اس کے ساتھ پھر انہوں نے دیگر مسائل بھی ملا دیئے ہیں جیسا کہ انسان کی استطاعت وغیرہ یا دیگر بہت سے ایسے امور ہیں کہ جو ان کی عقل نے لازم قرار دیئے ہیں اس طرح یہ لوگ خود بھی ہلاک ہوئے (عقیدے کے لحاظ سے) اور دوسروں کو بھی ہلاک کیا۔ اسی طرح ان پانچ اصولوں میں سے ایک اصول۔ ''منزلة بين المنزلتين'' بھی ہے آئندہ صفحات میں ہم ان پانچ اصولوں پر تفصیلی بحث کریں گے اور ایک ایک کر کے ان کے اصولوں کا تعاقب کریں گے۔

معتزلہ کے پانچ اصول یہ ہیں:

1. توحید
2. عدل
3. منزلة بين المنزلتين
4. وعد اور وعید
5. امر بالمعروف نہی عن المنکر

﴿پہلا اصول﴾ توحید

معتزلہ نے صفات باری تعالیٰ کی نفی کیلئے عقلی تصورات وترکیبات کا ایک سلسلہ چلائے رکھا یہ سلسلہ انہیں تعطیل کی طرف لے گیا پھر اس کے بعد دیگر بدعات جو اس

بارے میں انہوں نے ایجاد کیں وہ اس سلسلے کی کڑیاں تھیں پہلا زینہ یہ تھا۔

① تعطیل

تعطیل کا مطلب ہے اللہ کے وجود کیلئے حدوث وقدم کے ذریعے سے استدلال:

☆ اس بارے میں وہ کہتے ہیں کہ اجسام کے ساتھ کچھ متعین ومخصوص اعراض ہوتے ہیں (اعراض ان حالات وتغیرات کو کہتے ہیں جو کسی جسم کو درپیش یا اس کو لاحق ہوتے ہیں) جیسے کہ حرکت، سکون، جمع ہونا، علیحدہ ہونا، اسی طرح جسم کی دیگر صفات کے ساتھ کبھی جسم حرکت کرتا ہے پھر پرسکون ہوتا ہے کبھی پرسکون ہوتا ہے کبھی حرکت کرتا ہے یہ اعراض ہیں جو اجسام کو مختلف اوقات میں لاحق ہوتے ہیں (یہ ذات کا حصہ نہیں ہوتے)۔

☆ یہ اعراض حرکت وسکون وغیرہ حادث ہیں اس لیے کہ ان میں تغیر ہوتا ہے جبکہ قدیم میں تغیر نہیں ہوتا وہ ثابت رہتا ہے (ایک ہی حالت میں رہتا ہے) اسے تبدیلی لاحق نہیں ہوتی۔

☆ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر جسم ہر وقت اعراض سے خالی نہیں ہوتا ہمیشہ ایسا ہی ہوتا۔

☆ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اجسام مُحْدَث ہیں یعنی قدیم نہیں ہیں پہلے نہیں تھے بعد میں پیدا ہوئے ہیں۔(فتاوی ابن تیمیۃ رحمہ اللہ:۳/۳۰۳،مذاھب الاسلامیین البدوی:۱/۳۹۸)

جب یہ ثابت ہوگیا کہ اجسام مُحْدَث ہیں تو پھر ضروری ہے کہ ان کیلئے کوئی محدِث (پیدا کرنے والا) بھی ہو اس لیے کہ اجسام تین حالتوں سے خالی نہیں ہوتے۔

① **یا تو ناممکن الوجود ہو:** یہ تو فرض کرنے، تصور کرنے کے خلاف ہے اس لیے کہ ہم اجسام موجودہ سے بحث کررہے ہیں۔

② **یا واجبۃ الوجوب ہو:** یہ بھی ممکن الوجود نہیں ہے اس لیے کہ واجب الوجود بنفسہ عدم کو قبول نہیں کرتا جبکہ مُحْدَث وجود سے پہلے معدوم ہوتا ہے۔(درء تعارض العقل والنقل لابن تیمیۃ رحمہ اللہ ۸/۲۹۸)

③ **یا ممکنۃ الوجود ہو:** اس طرح کا وجود فرض کرنے کے بعد مُحْدَث دو احتمالات کے درمیان ہوتا ہے۔ یا تو وہ ممکن الوجود ہوگا یا اس کا عدم وجود ممکن ہوگا۔ یہ دونوں احتمال مساوی ہیں کسی مُحْدَث کا حدوث، کسی معدوم کا بالفعل وجود میں لانا محتاج ہے کسی مرجِّح کا (ترجیح دینے والے کا) تاکہ وہ کسی مُحْدَث کو مخصوص وقت اور مکان میں وجود میں لانے کو ترجیح دے سکے۔ یہ مرجِّح (ترجیح دینے والا) اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہے۔(المصدر السابق:۸/۳۰۷)

جب ان لوگوں کے ہاں اس طرح (صانع) پیدا کرنے والا ثابت ہوگیا تو انہوں نے اللہ کی ان صفات میں جو کہ قرآن وسنت میں بیان ہوئی ہیں جیسے سمع، بصر، علم، ہاتھ، رضامندی، غضب وغیرہ میں غور وفکر کیا۔ تو انہوں نے کہا کہ ہمارے سامنے یہ تو واضح ہو چکا ہے کہ صفات اجسام کی اعراض ہیں اور یہ مُحْدَث ہیں اگر ہم اللہ کیلئے قدیم صفات ثابت کریں گے تو اس طرح ہمیں دو قدیم ماننے پڑیں گے جبکہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ صفات ذات سے زائد اشیاء ہوتی ہیں اس لیے کہ صفت اور موصوف میں مغائرت ہوتی ہے۔ لہٰذا اللہ کی ایسی صفت بیان نہیں کی جاسکتی جس میں ایجابی معنی ہو جیسا کہ علم یا قدرت وغیرہ۔ بلکہ بہتر یہ ہے کہ ہم اس کیلئے صرف سلبی صفات بیان کریں۔ وہ اللہ ایک ہے اس جیسا کوئی نہیں ہے۔﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ وہ جسم نہیں ہے، وجود نہیں ہے۔ جثہ (بدن) نہیں ہے، صورت (تصویر) نہیں ہے، خون اور گوشت نہیں ہے، ذات اور جوہر نہیں، عرض نہیں، اس کا کوئی رنگ نہیں، ذائقہ نہیں، بو نہیں محسوس نہیں کیا جاسکتا حرارت، برودت، رطوبت و یبوست، طول وعرض، عمق، اجتماع، افتراق، حرکت وسکون اس سے محسوس نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے حصے، اجزاء، اعضاء، جوارح بیان نہیں کی جاسکتیں۔ جہات دائیں بائیں وغیرہ اس کیلئے بیان نہیں کیا جاسکتا اس طرح انہوں نے ساری صفات سلبی بیان کی ہیں۔

(مقالات الاسلامیین للاشعری:۱۵۵)

اللہ کی صفات سمع وبصر وغیرہ سے انہوں نے منع کیا ہے کہتے ہیں وہ عالم ہے بغیر علم کے قادر ہے بغیر قدرت کے، سمیع ہے بغیر سماعت کے۔ اشعری نے علاف معتزلی کا نظریہ ذکر کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کی صفات عین ذات ہیں۔ اشعری فرماتے ہیں ابوالہذیل نے کہا: اللہ تعالیٰ عالم ہے ایسے علم کے ساتھ کہ وہ علم خود وہی ہے۔ وہ قادر ہے ایسی قدرت کے ساتھ کہ وہ قدرت خود وہی ہے۔ زندہ ہے ایسی زندگی کے ساتھ کہ وہ زندگی خود ہی اللہ ہے۔ اشعری فرماتے ہیں: اکثر معتزلہ وخوارج

اور بہت سے مرجئہ اور بعض زیدیہ کہتے ہیں کہ اللہ قادر ہے زندہ ہے بنفسہ۔کوئی اور علم، حیات، قدرت وغیرہ نہیں ہے۔(المصدر السابق:١٦٤،١٦٥)

بعض نے اللہ کی ان صفات کی تفسیر اس طرح کی ہے کہ ''وہ عالم ہے'' کا معنی یہ ہے کہ وہ جاہل نہیں ہے قدرت کا معنی یہ ہے کہ وہ عاجز نہیں وغیرہ۔اللہ کی صفات جس طرح انہوں نے بیان کی ہیں اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ نہ اللہ کا علم ہے نہ قدرت ہے نہ زندگی ہے نہ ارادہ۔یہی قول جہم بن صفوان کا تھا جو ان سے پہلے گذرا ہے۔اللہ ان کے ایسے اقوال سے بہت بلند ہے۔(عقائد السلف للنشار:٦٢)

اس طرح انہوں نے اللہ کی دیگر صفات کی بھی تاویلات کی ہیں وہ صفات جو اللہ نے اپنے لیے ثابت کی ہیں مثلاً اللہ کا فرمان ہے﴿بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ﴾ اللہ کے دونوں ہاتھ فراخ ہیں۔اس طرح ﴿وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ﴾ تیرے رب کا چہرہ باقی رہے گا۔یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس طرح کی صفات کو اسی طرح ماننا اللہ کے لائق جو پاکی ہے اس کے منافی ہے (یعنی جیسا قرآن میں ذکر ہے اگر ان کا مطلب یہی لیا جائے تو کما حقہ اللہ کی پاکی بیان نہیں کی جا سکتی ایسی پاکی جو اللہ کی ذات کے شایانِ شان ہو) دوسری بات یہ ہے کہ اگر اللہ کیلئے چہرہ، ہاتھ وغیرہ تسلیم کر لیے جائیں تو پھر اللہ کا جسم بھی ماننا پڑے گا۔(نقض تاسيس الجهمية:٩٣)

لہٰذا آیت کی تاویل ضروری ہے تا کہ ظاہری معنی کی بجائے کوئی اور معنی لیا جا سکے۔تاویل انہوں نے اس طرح کی ہے کہ ''وجه الله'' سے مراد اللہ ہے اور ''يد الله'' سے مراد اس کی سخاوت ہے اور جس آیت میں اللہ کی آنکھ کا ذکر ہے اس سے مراد اس کا علم اور علم کی وسعت ہے جیسا کہ آیت ﴿وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ﴾ ''اے موسیٰ! (علیہ السلام) تا کہ میری آنکھ کے سامنے تیری پرورش کی جا سکے۔'' جس آیت میں فرمایا ﴿لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ﴾ '' جسے میں نے اپنے دو ہاتھوں سے بنایا ہے۔'' ہاتھ سے مراد قدرت ہے۔اسی طرح دیگر جتنی صفات ہیں ان سب میں تاویل کرنی ہوگی تا کہ اللہ کی پاکی بیان ہو سکے اور خالق کو مخلوق کی مشابہت سے بچایا جا سکے!!

ان صفات کی نفی کے ساتھ ہی انہوں نے اللہ کے عرش پر مستوی ہونے کا بھی انکار کیا ہے یہ کہہ کر کہ اس سے یہ لازم آئے گا کہ ایک جسم نے دوسرے جسم کو مَس کیا ہے، چھو رکھا ہے۔جبکہ اللہ کے بارے میں اس طرح کا تصور جائز نہیں ہے لہٰذا انہوں نے ان آیات کی تاویل کی جن میں اللہ کے مستوی عرش ہونے کا ذکر ہے۔﴿الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ رحمٰن عرش پر مستوی ہے اس کی تاویل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ استواء سے مراد استیلاء یعنی غلبہ وقبضہ ہے جس طرح کہ عربی محاورہ ہے (استوى بشر على المدينة) ''کوئی انسان شہر پر مستولی ہوا'' یعنی قبضہ کر لیا غالب آ گیا۔اسی طرح انہوں نے مخلوق پر اللہ کی بلندی کا بھی انکار کیا ہے۔کہتے ہیں کہ اس طرح اللہ کے لیے حیز ماننا پڑے گا اللہ کو ایک جہت میں متحیز ماننا پڑے گا جبکہ اللہ کیلئے حیز نہیں ہے نہ ہی وہ حدود میں محدود ہو سکتا ہے۔اگر اس طرح تسلیم کر لیں تو یہ ماننا پڑے گا کہ اللہ ایک مخلوق یعنی جہت میں داخل ہے۔(حیز کا لغوی معنی ہے ایک جگہ میں منحصر ہونا محدود ہونا۔فلسفہ کی اصطلاح میں حیز کی تعریف ہے۔''ما به تتمايز الاجسام في الاشارة الحِسّيّة'' یعنی حیز وہ شئ ہے جس کے ساتھ اجسام اشارہ حسیہ میں ایک دوسرے سے ممتاز ہوتے ہیں۔حیز طبعی اس حیز کو کہتے ہیں کہ جب جسم اس میں رہے تو قرار پکڑے رہے جب اس میں نہ رہے تو اسے طلب کرے۔مترجم، ہدایت الحکمت)

② قیامت میں اللہ کے دیدار کی نفی

جب معتزلہ نے اپنے مذکورۃ الصدر تصورات وافکار کی وجہ سے جسمیت، صفات، جہۃ، تحیز کا انکار کیا تو اس بات کا بھی انکار کیا کہ قیامت میں مؤمنین اللہ کا دیدار کر سکیں گے۔(فتاوى ابن تيمية رحمه الله:٣/٣٠٥)

قرآن مجید میں جو آیات ہیں مثلاً ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾ بہت سے چہرے اس دن تر وتازہ ہوں گے اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔(القيامة:٢٢-٢٣) اس آیت کی تاویل وہ یہ کرتے ہیں کہ ناظرۃ کا مطلب دیکھنا نہیں بلکہ انتظار ہے کہ وہ اپنے رب کا انتظار کریں گے کہ وہ ان کے ساتھ کیسا برتاؤ اور سلوک کرتا ہے جیسا کہ عربی میں کہا جاتا ہے۔(انا الى فلان ناظر ما يفعل بي) میں فلاں کے انتظار میں ہوں کہ وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔ناظر لفظ امید اور توقع کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔(كشاف زمخشرى:٢/٤٤٠)

اس بارے میں جو احادیث مروی ہیں ان کا یہ کہہ کر انہوں نے انکار کر دیا ہے کہ یہ خبر واحد ہیں۔

اللہ کو نہ دیکھ سکنے کیلئے ان قرآنی آیات سے استدلال کرتے ہیں:

﴿لَاتُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ﴾ ''آنکھیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں۔'' (الانعام:١٠٣)

موسیٰ علیہ السلام کے لئے اللہ کا فرمایا:﴿قَالَ رَبِّ اَرِنِیٓ اَنْظُرْ اِلَیْکَ قَالَ لَنْ تَرٰنِی﴾ ”موسیٰ علیہ السلام نے کہا! اے رب! مجھے دکھلا دے میں تجھے دیکھنا چاہتا ہوں۔اللہ نے فرمایا! تو مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتا۔“ (الاعراف:۱۴۳) ﴿یَسْئَلُکَ اَھْلُ الْکِتَابِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَیْھِمْ کِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓی اَکْبَرَ مِنْ ذٰلِکَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰہَ جَھْرَۃً فَاَخَذَتْھُمُ الصّٰعِقَۃُ بِظُلْمِھِمْ﴾ ”(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اہل کتاب تجھ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ تو ان پر آسمان سے کتاب نازل کر۔انہوں نے موسیٰ (علیہ السلام) سے اس سے بھی بڑا مطالبہ کیا تھا کہا تھا کہ ہمیں اللہ دکھا دے ظاہر لہٰذا پکڑ لیا انہیں آسمانی بجلی نے ان کے ظلم (بے جا مطالبے) کی وجہ سے۔“ (النساء:۱۵۳)(الکشاف للزمخشری:۱/۱۹۸)

③ کلام اللہ قرآن (کو مخلوق ماننا)

قرآن کو اللہ کی مخلوق قرار دینے میں معتزلہ نے جہم بن صفوان کی اتباع کی ہے۔صفات باری تعالیٰ کے مسئلہ پر معتزلہ اور جہم تقریباً ہم خیال تھے مثلاً اگر قرآن اللہ کا کلام ہو مخلوق نہ ہو تو پھر یہ صفت بنے گی اور اللہ کے ساتھ قدیم ماننی پڑے گی اس طرح پھر دو خدا ماننا لازم آتا ہے۔اسی طرح قرآن ایسے اوامر، نواہی، حوادث وقصص پر مشتمل ہے جو مختلف ادوار میں پیش آتے رہے ہیں تو یہ ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان قصوں اور واقعات اور اوامر ونواہی پر مسلسل کلام کرتا رہا ہو یہی وجہ ہے کہ اللہ نے قرآن میں جو کہا ہے کہ ﴿کَلَّمَ اللّٰہُ مُوْسٰی تَکْلِیْمًا﴾ (النساء:۱۶٤) ”اللہ نے موسیٰ (علیہ السلام) سے کلام کیا“ تو یہ کلام اللہ نے موسیٰ علیہ السلام سے نہیں کیا تھا بلکہ موسیٰ علیہ السلام کے اردگرد جو موجودات تھیں ان میں سے اللہ نے کلام پیدا کیا اور موسیٰ علیہ السلام نے ان اشیاء سے کلام سنا (کہتے ہیں کہ وہ درخت تھا جس سے موسیٰ علیہ السلام نے کلام سنا)(قرطبی:٦/١٨،رسالۃالرد علی الجھمیۃ لا حمد بن حنبل رحمہ اللہ:٨٧)

یہ معتزلہ کا اجمالی عقیدۂ توحید تھا یعنی صفات کی نفی یا ان کی تعطیل، اللہ کا عرش پر مستوی ہونے اور مخلوق سے بلند ہونے، قیامت میں اللہ کے دیدار کی نفی، اور قرآن کو مخلوق قرار دینا۔

اہل سنت کا عقیدہ اس عقیدے کے بالکل برعکس اور مخالف ہے اہل سنت معتزلہ کے عقیدے کو صحیح احادیث کی نفی وصریح عقلی دلائل سے ردّ کرتے ہیں۔اللہ کے وجود کا اس طرح اثبات کہ جس طرح معتزلہ ثابت کرتے ہیں قدم وحدوث کے ذریعے، یہ خوامخواہ تکلف ہے جس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔اس لیے کہ کائنات میں پھیلے ہوئے دلائل سب کے سب اللہ کے وجود پر شاہد ہیں ایسا اللہ جو خالق ہے، علیم ہے، حکیم ہے، مگر ان دلائل سے وہی شخص مطمئن ہوگا جس کی فطرت سلیم ہو۔موجودات اللہ کے وجود پر اس طرح دلالت کرتے ہیں کہ عقل اس بات کو تسلیم ہی نہیں کر سکتی کہ موجودات ہوں مگر کوئی موجد نہ ہو۔یہ ایسی بات ہے کہ ہر شخص اسے محسوس کر سکتا ہے۔صفات کی نفی پر جن دلائل وبراہین نے انہیں آمادہ کیا وہ یہ ہیں کہ صفات اعراض ہیں مُحدَث ہیں اور صفات واعراض صرف جسم کو لاحق ہوتے ہیں۔ان کی اس بات کی بنیاد دو اہم امور پر ہے:

① مجمل اصطلاحات: جسم، عرض، تحیز وغیرہ کا استعمال، جبکہ سلف نے ان اصطلاحات کو استعمال کرنے سے احتراز کیا ہے اس لیے کہ ان میں اجمال واشتراک ایسا ہے کہ اکثر لوگ ان میں تمیز نہیں کر سکتے بلکہ ان اصطلاحات کا استعمال اکثر کے نزدیک عقائد کے بگاڑ کا سبب ہے (اشتراک کا معنی ہے کسی لفظ کا کئی معنوں پر دلالت کرنا۔یعنی ایک لفظ کے کئی معنی ہوں اور اکثر لوگ یہ فیصلہ اور تمیز نہ کر سکتے ہوں کہ کس جگہ اس لفظ سے کون سا معنی مراد لیا جائے گا۔مترجم)

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔سلف اور ائمہ کرام نے علم کلام کو صرف اس کی اصطلاحات، جوہر، عرض، جسم وغیرہ کی وجہ سے ناپسند نہیں کیا بلکہ اس وجہ سے ناپسند کیا ہے کہ ان الفاظ سے اہل کلام نے غلط اور مذموم معانی ومقاصد لیے ہیں ان کو ہی دلائل اور احکام کے طور پر استعمال کیا ہے جبکہ یہ الفاظ نفی واثبات کے معانی دینے میں مجمل ہیں (مجمل کا معنی ہے جو وضاحت اور تفسیر کا محتاج ہو۔مترجم)۔امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اہل بدعت کی پہچان کراتے ہوئے کہتے ہیں: یہ لوگ کتاب اللہ میں اختلاف اور کتاب اللہ کی مخالفت کرنے والے ہیں۔کتاب اللہ کی مخالفت پر متفق ہیں۔کلام اللہ میں سے متشابہات آیات کو ہی لیتے ہیں اور ان متشابہات کے بارے میں بات کرتے ہوئے لاعلم عوام کے ذہنوں کو خراب کرتے ہیں۔(فتاویٰ ابن تیمیۃ رحمہ اللہ:٣/٣٠٧، نقض التاسیس/١٠٠)

② غائب کو حاضر پر قیاس کر کے انہوں نے غلطی کی ہے۔(نقض التاسیس:٣٢٦،الفتاوی٣/٢٧)

اللہ تعالیٰ کو مخلوق پر قیاس کرنا جیسا کہ یہ کہتے ہیں کہ اجسام کیلئے صفات ضروری ہیں اور صفات اعراض ہیں جو زائل ہو سکتے ہیں ختم ہو سکتے ہیں۔لہٰذا اللہ جسم نہیں ہے جب

جسم نہیں تو اس کی ایسی صفات بھی نہیں جو زائل ہوسکیں یہاں انہوں نے اللہ کی صفات کو مخلوق کی صفات پر قیاس کیا ہے اس طرح یہ لوگ مجسمہ اور مُشبّہہ فرقوں کے بالکل برعکس عقیدہ رکھتے ہیں۔ یہ دونوں فرقے کہتے ہیں کہ جب اللہ نے اپنے لیے علم، قدرت، غضب، چہرہ، ہاتھ وغیرہ صفات بیان کی ہیں جو کہ اجسام کی خاصیت ہے تو اللہ بھی جسم ہے پھر انہوں نے اللہ کیلئے جسم ثابت کیا ہے۔ اس طرح بہت سارے فرقے ہیں جن کی موجودگی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

(مقالات الاسلامیین للاشعری:۲۰۷)

معتزلہ اور جہمیہ میں سے معطلہ کے ساتھ ساتھ ان دونوں مذکورہ فرقوں نے بھی اشتراک کیا ہے اور جو بھی ان فرقوں کی پیروی کرتا ہے وہ بھی اشتراک کرتا ہے اس لیے انہوں نے اللہ کی صفات کی وجہ سے اللہ کیلئے جسم ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اب معتزلہ اور جہمیہ نے اللہ کے جسم کے محال ہونے کی وجہ سے صفات کی نفی کردی اور مجسمہ نے صفات کے اثبات کی وجہ سے جسم ثابت کیا ہے لہٰذا دونوں قسم کے فرقے ظالم جاہل ہیں (یہ سب فرقے صفات کے معاملے میں افراط وتفریط کا شکار ہیں اور جیسا کہ اللہ ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صفات بیان کی ہیں اس طرح نہیں مانتے لہٰذا سب باہم یکساں ومشترک ہیں)

اس لیے کہ اللہ کی صفات ثابت کرنے سے اس کا جسم ثابت نہیں ہوتا الاّ یہ کہ اللہ کو مخلوق پر قیاس کیا جائے اور جس نے ایسا کیا ہے اس نے بنیادی غلطی کی ہے اور مکمل طور پر غلط راہ پر چل پڑا ہے۔

اللہ نے اپنے آپ کو علیم وحکیم کہا ہے اور اپنے بعض بندوں کو بھی علیم کہا ہے ﴿فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ﴾ ''ہم نے اسے حلیم (بردبار) بیٹے کی خوشخبری دی'' (الصّٰفّٰت:۱۰۱) حالانکہ یہ بات واضح ہے کہ اللہ کا حلیم ہونا اور بیٹے کا حلیم ہونا برابر نہیں ہے۔ نہ ہی کسی انسان کا حلیم ہونا اللہ کے حلیم ہونے کے برابر ہے۔ جیسا کہ اللہ نے خود کو سمیعًا بصیرًا کہا ہے۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًا بَصِيْرًا﴾ (النساء:۵۸) اور اپنے بعض بندوں کو بھی سمیع وبصیر کہا ہے۔ ﴿اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا﴾ ''ہم نے انسان کو مخلوط نطفے سے پیدا کیا پھر ہم نے اسے سمیع وبصیر بنایا۔'' (الدھر:۲) حالانکہ انسان اللہ کی طرح سمیع وبصیر نہیں ہے۔ اللہ نے خود کو حیّ (زندہ) کہا ہے۔ ﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ﴾ اللہ ایک ہے وہ زندہ ہے قائم رہنے والا تھامنے والا ہے۔ (البقرۃ:۲۵۵) اسی طرح اپنی بعض مخلوق کو بھی حیّ کہا ہے ﴿يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ﴾ زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے۔ اسی طرح اللہ کی دیگر صفات کا بھی معاملہ ہے وہ بھی ثابت ہیں مگر انسانوں کی صفات کی طرح نہیں۔ جیسا کہ اللہ کیلئے ارادہ، علم، قدرت، غضب، محبت، ہاتھ، چہرہ وغیرہ کا ذکر ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ صفات انسانوں کی صفاتِ، ارادہ، علم، قدرت وغیرہ کی طرح ہیں۔ (فتاویٰ ابن تیمیۃ رحمہ اللہ:۳/۱۰)

بلکہ یہ ایسی صفات ہیں جیسے اللہ کی ذات کے لائق ہیں ہم (اہلسنت) اللہ کی صفات کو مانتے ہیں مگر بغیر تشبیہ، تمثیل اور تعطیل کے۔ امت کے اسلاف اور ائمہ کی یہی رائے ہے کہ وہ اللہ حیّ ہے زندہ ہے مگر اس کی زندگی مخلوق کی زندگی کی طرح نہیں ہے نہ وہ اس زندگی کی جنس میں سے ہے۔ وہ عالم ہے مگر مخلوق کی طرح نہیں اور نہ ہی اس کا علم مخلوق کے علم کی جنس میں سے ہے۔ وہ قادر ہے مگر اس کی قدرت مخلوق کی قدرت کی طرح نہیں ہے نہ اس کی جنس میں سے ہے۔ اسی طرح اللہ کی دیگر صفات بھی ہیں مثلاً اس کا ہاتھ ہے مگر انسانوں کے ہاتھوں کی طرح نہیں نہ اس کی جنس سے ہے۔ اس اللہ کا چہرہ ہے مگر مخلوق کے چہروں کی جنس سے نہیں نہ ہی ان کی طرح ہے۔ اسی طرح سلف نے استواء علی العرش بھی ثابت کیا ہے مگر بغیر کیفیت، مماثلت اور تاویل کے۔ اسی طرح سلف نے مخلوق پر اللہ کی بلندی کو بھی ثابت مانا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ (فاطر:۱۰)

''اسی (اللہ) کی طرف پاکیزہ کلام چڑھتا ہے اور عمل صالح اس (کلام) کو بلند کردیتا ہے''

فرمان باری تعالیٰ ہے:

ءَ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا هِيَ تَمُوْرُ O (الملک:۱۶)

''کیا تم اس ذات سے بےخوف ہوگئے ہو جو آسمان میں ہے اس بات سے کہ وہ تم کو زمین میں دھنسا دے۔''

مالک بن انس رحمہ اللہ کے پاس ایک شخص آیا اس نے کہا اے ابوعبدالرحمٰن! اللہ فرماتا ہے کہ ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ رحمان عرش پر مستوی ہے (طٰہٰ:۵) تو یہ بتلایئے کہ استویٰ کیسا ہے؟ مالک رحمہ اللہ نے فرمایا: ((الکیف غیر معقول والاستواء منه غیر مجهول والایمان به واجب والسوال عنه بدعة

وانی اخاف ان تکون ضالًا))اس کی کیفیت سمجھائی نہیں جاسکتی نہ سمجھی جاسکتی ہے۔استواء معلوم ہے اسپر ایمان لانا واجب ہے مگر (استواء کی کیفیت سے متعلق) سوال کرنا بدعت ہے۔مجھے اندیشہ ہے کہ تو گمراہ نہ ہو جائے۔پھر مالک رحمہ اللہ نے حکم دیا تو اس شخص کو وہاں سے نکال دیا گیا۔(شرح اصول اعتقاد اهل السنة للحافظ اللا لکائی:۳۹۸)

امام ابوسعید الدارمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ہم نے اللہ کا فرمان سن لیا جس میں وہ فرماتا ہے کہ ﴿استوی علی العرش﴾" اللہ عرش پر مستوی ہے۔"اور ﴿واستوی الی السماء﴾" آسمان کی طرف استویٰ کیا۔"اور فرماتا ہے ﴿ذِی الْمَعَارِجِ ، تَعْرُجُ الْمَلٰئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ ﴾"اللہ بلندیوں والا ہے اسی کی طرف فرشتے اور جبریل (علیہ السلام) چڑھتے ہیں۔"(المعارج:۳-٤)اسی طرح کی دیگر آیات ہیں۔ہم ان پر ایمان لائے ہیں اور ان پر یقین کرلیا ہے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اللہ عرش پر مستوی ہے آسمانوں کے اوپر جیسا کہ اس نے خود بیان کیا ہے، اپنی مخلوق سے دور۔(الرد علی الجهمیة للدارمی،عقائد السلف:۲٦۹،الرد علی الجهمیة لاحمد بن حنبل رحمہ اللہ:۸۵)

اللہ کے دیدار کا جو مسئلہ ہے تو اس بارے میں متکلمین کے پیش کردہ دلائل دنیا والوں کے بارے میں ہیں اس لیے کہ دنیا میں اللہ نے ان کو محدود صلاحیتیں وطاقتیں دی ہیں آخرت میں جو طاقت وصلاحیت دی جائے گی وہ دنیاوی طاقت سے مختلف ہوگی۔کتاب وسنت کے صحیح دلائل سے ثابت ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن مومنوں کو عزت دے گا اپنا دیدار کرواکر۔اللہ کیلئے یہ کام ناممکن نہیں ہے نہ ہی اس سے جسمیت لازم آتی ہے۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ﴿اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾"اپنے رب کی طرف دیکھنے والے۔"(القیامة:۲۳)یہ دیکھنے پر صراحتاً دلالت کرنے والا لفظ ہے۔

صحیح مسلم میں صہیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: ﴿لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ﴾"اچھائی کرنے والوں کیلئے اچھا بدلہ اور مزید اجر ہے۔"(یونس:۲٦)جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب جنتی جنت میں اور جہنمی جہنم میں داخل ہو جائیں گے تو ایک پکارنے والا پکارے گا: اے اہلِ جنت! اللہ کے ہاں تمہارے لیے ایک وعدہ ہے اور وہ چاہتا ہے کہ اسے پورا کرلے۔تو جنتی کہیں گے وہ کون سا وعدہ ہے؟ کیا اللہ نے ہمارے میزان کے پلڑے بھاری نہیں کیے؟ ہمارے چہرے سفید وروشن نہیں کیے؟ ہمیں جنت میں داخل نہیں کیا؟ ہمیں آگ سے نہیں بچایا؟ تو پردہ ہٹ جائے گا۔یہ لوگ اللہ کو دیکھ لیں گے تو ان لوگوں کو اللہ کے دیدار سے زیادہ کوئی چیز محبوب نہ ہوگی۔یہی معنی ہے آیت میں لفظ ﴿وَزِيَادَةٌ﴾ کا۔

صحیح بخاری ومسلم میں ابوالیمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہتے ہیں لوگوں نے سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا قیامت کے دن ہم اپنے رب کو دیکھ سکیں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب بادل نہ ہوں تو سورج کو دیکھنے میں تمہیں کوئی دقت ہوتی ہے؟ لوگوں نے کہا: نہیں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: جب بادل نہ ہوں تو چاند دیکھنے میں کوئی مشکل پیش آتی ہے؟ لوگوں نے کہا: نہیں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسی طرح تم اپنے رب کو دیکھو گے(مسلم: کتاب الایمان)یہی مسلک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ سے مروی ہے۔

(شرح اصول اعتقاد اهل السنة للحافظ اللا لکائی:۳/٤۸۰)

مسئلہ خلقِ قرآن

ائمہ اسلام نے خلقِ قرآن کے عقیدے کی شدید ترین مذمت کی ہے۔اور اسے بدعت قرار دیا ہے

عمرو بن دینار رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ملاقات کر چکا ہوں اور ان کے بعد کے علماء (تابعین رحمہم اللہ) سے بھی، وہ سب کہتے تھے کہ اللہ خالق ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے سب مخلوق ہے۔قرآن اللہ کا کلام ہے۔اسی اللہ سے اس کا صدور ہوا ہے اور اسی کی طرف لوٹ کر جائے گا۔

حافظ لالکائی رحمہ اللہ نے اصول اعتقاد اہل السنة والجماعة میں ان علماء کے نام لکھے ہیں جو قرآن کو غیر مخلوق کہتے تھے۔تقریباً ساڑھے پانچ سو نام ہیں جن میں تابعین اور ائمہ فقہاء شامل ہیں اور ان کا تعلق مختلف ممالک سے ہے۔اسی طرح ان بدعتی اعتقادات کی مذمت میں اکابر ائمہ اہلِ سنت نے بھی کتابیں لکھی ہیں جن میں امام احمد بن حنبل، امام بخاری، امام دارمی اور امام ابن تیمیہ رحمہم اللہ اجمعین شامل ہیں۔

﴿دوسرا اصول﴾ عدل

معتزلہ نے اللہ کی صفات پر جس طرح رائے زنی کی ہے اوران صفات کو سمجھنے سمجھانے کیلئے عقلی قیاسات کے تابع کیا ہے اور جس طرح انہوں نے اپنے مباحث میں اصطلاحات اورناموں کو خلط ملط کیا اور اللہ کو مخلوق پر قیاس کیا، ان کے اس طرز عمل نے انہیں مجبور کیا ہے کہ وہ دیگر مسائل میں بھی اسی طرح کا طریقہ اپنائیں اور انہوں نے ایسا ہی کیا اور بہت سے مسائل میں انہوں نے علیحدہ نظریات اپنائے ہیں مثلاً مندرجہ ذیل اصطلاحات اور مسائل پر غور کریں:

❶ تقدیر کی نفی

❷ بندوں کے افعال کوانہی کی تخلیق قرار دینا

❸ تولد

❹ صالح اوراصلح

❺ تحسین تقبیح کو عقلی چیزیں قرار دینا

ان مسائل میں سے ہرایک پر ہم مختصراً روشنی ڈالیں گے

① **تقدیر کی نفی:** معتزلہ کہتے ہیں کہ عدل کا تقاضا یہ ہے کہ کسی شخص سے صرف اس عمل کا حساب لیا جائے جو اس کے ہاتھوں سرزد ہوا ہے اور جن کاموں پر اسے مجبور کیا گیا تو ان میں کوئی محاسبہ اور سزا نہیں ہونی چاہیے جیسا کہ ظلم کرنے والا ظالم ہوتا ہے شر پھیلانے والا، برائی کرنے والا برا شمار ہوتا ہے جبکہ اللہ کی ذات ظلم کرنے والی نہیں ہے:﴿وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ﴾ ''تیرا رب بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔''(حمٓ السجدۃ:٤٦)﴿وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ﴾ ''ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا مگر وہ خود پر ظلم کرنے والے تھے۔''(النحل:١١٨) ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ نے انسانوں کیلئے کچھ مقرر نہیں کیا تقدیر نہیں لکھی نہ ہی کوئی فیصلہ پہلے سے کررکھا ہے بلکہ انسان اپنے اعمال وافعال میں مختار ہیں اپنے اعمال میں مکمل طور پر آزاد ہیں اپنی مرضی کے مالک ہیں انسان جو بھی عمل کرتا ہے اس میں اللہ کے ارادے کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ جب ہم یہ نظریہ مان لیں گے تو اب ثواب وسزا، اللہ کے عدل کو زیادہ بہتر انداز سے ثابت کرے گا۔

اپنے اس نظریہ کو ثابت کرنے کیلئے معتزلہ نے قرآنی آیات سے استدلال کیا ہے﴿فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ﴾ ''جو چاہے مؤمن بن جائے جو چاہے کفر اختیار کرلے۔''(الکھف:٢٩)﴿اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا﴾ ''ہم نے اس (انسان) کو دونوں راستے دکھلا دیئے ہیں چاہے تو وہ شکر گذار بن جائے چاہے تو ناشکرا بنے۔''(الانسان:٣) جس آیت میں ہے کہ﴿وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ''اورتم نہیں چاہتے مگر جو اللہ رب العالمین چاہے۔''(التکویر:٢٩) تو اس آیت کی وہ تاویل کرتے ہیں۔

② **بندوں کے افعال کی تخلیق:** معتزلہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتا نہ ہی کسی کو مجبور کرتا ہے کسی معصیت یا اطاعت پر۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دنیا میں ہرطرف برائیاں دیکھ رہے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کافر معصیت کے کام کرتے ہیں اورانہیں کسی قسم کا خوف نہیں۔ فاسق ہر قسم کی برائیاں کررہے ہیں اور انہیں کوئی پرواہ نہیں ہے جو ظلم کرتا ہے وہ ظالم ہے جو غلط کرتا ہے وہ غلط آدمی ہے لہٰذا انسان اپنے اعمال وافعال کے خود ذمہ دار اور خالق ہیں۔ جبکہ اللہ نہ تو شر کو پسند کرتا ہے نہ ہی شر کا ارادہ کرتا ہے نہ شر والا کام کرتا ہے نہ کسی کی تقدیر میں لکھتا ہے نہ کسی پر مقرر کرتا ہے۔ اگر اللہ کی یہ مشئیت ہوتی تو وہ شر کو پسند بھی کرتا اور جب وہ شر کو پسند کرتا کسی کیلئے اسے مقرر کرتا کسی کی تقدیر میں لکھ دیتا تو پھر کرنے والے کو سزا دینا صحیح نہ ہوتا۔ اپنے اس نظریہ کو ثابت کرنے کیلئے انہوں نے قرآنی آیات کا سہارا لیا اوران کا مفہوم ومطلب اپنی رائے کے مطابق لیا ہے اور جو آیات ان کی آراء سے متصادم تھیں ان کی تاویل کی۔ ان کے دلائل حسب ذیل ہیں۔

❶ ﴿فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ ہلاکت وبربادی ہے ان لوگوں کیلئے جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے۔(البقرۃ:٧٩)

❷ ﴿مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ﴾

جس نے بھی برائی کی اسے سزاء دیجائیگی۔(النساء:١٢٣)

❸ ﴿اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ﴾
آج کے دن ہم ہر شخص کو اس عمل کا بدلہ دیا جائیگا جو اس نے کیا ہوگا۔(المؤمن:١٧)

اور آیت ﴿وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ ''اللہ نے تمہیں پیدا کیا اور تمہارے اعمال کو'' (الصّٰفّٰت: ٩٦) ﴿اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ﴾ ''اللہ ہر چیز کا خالق ہے۔'' (الزمر:٦٢) ان آیات کی وہ تاویلیں کرتے ہیں۔ان معتزلہ کے بالکل برعکس عقیدہ ونظریہ جبریہ کا ہے جو کہ جہم بن صفوان کے پیروکار تھے انہوں نے مکمل طور پر انسانی ارادے اور اختیار کا انکار کیا ان کا نظریہ اس بارے میں یہ ہے کہ انسان بے اختیاری میں ایسا ہی ہے جیسا درخت ، پتھر وغیرہ۔اور جن آیات میں افعال کی نسبت انسانوں کی طرف کی گئی ہے تو یہ مجازی نسبت ہے۔جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ درخت نے پھل دیا۔حالانکہ درخت کو حقیقت میں پھل دینے میں کوئی اختیار وارادہ نہیں ہوتا اسی طرح پتھر جب گرتا ہے تو اس میں بھی پتھر کا کوئی اختیار نہیں ہوتا دونوں فرقے حق سے نکل گئے ہیں دونوں باہم نقیض ومتضاد ہیں۔(صوفیاء نے بھی جبر کا عقیدہ اپنالیا ہے جو حلول اور وحدۃ الوجود کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ تمام افعال کا خالق حقیقی اللہ ہی ہے چاہے عمل اطاعت کا ہو یا معصیت کا یا کسی کافر کا کفر ہو لہٰذا کسی بھی قسم کے غلط کام پر کوئی شرمندگی یا ملامت نہیں ہے بلکہ جو شخص جیسا بھی عمل کرتا ہے وہ درحقیقت اللہ کی اطاعت ہی کرتا ہے اس لیے کہ وہ اللہ کے ارادے کے مطابق عمل کررہا ہے لہٰذا فرعون کا ایمان بھی صحیح تھا اور بچھڑے کی عبادت بھی صحیح تھی یہود ونصاریٰ اور مجوس بھی صحیح ہیں کہتے ہیں کہ ہم تو محبت کے دین کے قائل ہیں وہ جہاں چاہے ہمیں لے جائے محبت ہی ہمارا دین ایمان ہے۔ ❶

③ **تولد:** معتزلہ کے مذہب کا ایک لازمی اور اہم مسئلہ ان افعال سے بحث کرنا جو انسانوں کے افعال کا نتیجہ ہوتے ہیں جنہیں یہ لوگ انسان کی تخلیق کا نام دیتے ہیں ۔کہ کیا یہ افعال بھی انسان کی تخلیق میں شمار ہوں گے یا نہیں؟(مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے افعال کا خود خالق ہے مگر ان افعال کے نتیجے میں کچھ اور افعال یا ان افعال سے آگے جو افعال پیدا ہوتے ہیں کیا انسان ان کا بھی خالق ہے؟)مثلاً ایک انسان کسی حیوان کو ذبح کرتا ہے(ذبح کرنا تو انسان کا عمل ہوا مگر اس عمل کی وجہ سے ایک اور عمل یعنی روح کا اخراج عمل میں آیا اب)انسان روح کے اخراج کا بھی خالق ہے؟روح کا اخراج بھی انسانی عمل ہے یا نہیں؟اسی طرح ایک شخص پہاڑ کی چوٹی سے پتھر لڑھکاتا ہے وہ پتھر جا کر پہاڑ کے دامن میں کسی شخص کو لگتا ہے اور وہ مرجاتا ہے تو کیا پتھر گرانے والے کا عمل شمار ہوگا؟اسی طرح دیگر افعال جو متولدات کہلاتے ہیں معتزلہ کے بحث کا موضوع ہیں۔ان سوالوں کے جواب میں معتزلہ کے ائمہ میں باہم اختلاف ہے۔بشر بن معتمر کہتا ہے انسان ہی ان متولدات کا حقیقی فاعل کہلائے گا۔ابوالہذیل العلاف کہتے ہیں کہ انسان صرف اس عمل کا فاعل کہلائے گا جس کی کیفیت کو وہ جانتا ہو جس عمل وفعل کی کیفیت وہ نہیں جانتا وہ اس کا فاعل نہیں ہے۔ثمامہ بن اشرس کہتے ہیں کہ متولدات کا کوئی فاعل نہیں ہوتا۔نظام کہتا ہے طبعی طور پر یہ اللہ کے افعال ہیں یعنی ان سب افعال کو اللہ نے ایک خاص طبیعت ومزاج

---

❶ اشاعرہ نے معتزلہ اور جبریہ کے مابین کا نظریہ اپنایا ہے جیسا کہ ان کے امام ابوالحسن اشعری کہتے ہیں کہ ہمارا نظریہ کسب کا یعنی اللہ تعالیٰ ہی ہر کام کا فاعل ہے مگر وہ اپنے بندوں کیلئے کسب تخلیق کرتا ہے اور پھر اس کسب کے ذریعے سے بندہ عمل کرتا ہے پھر کسب کے معنی میں ان میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ کسب کا معنی ہے عزم وارادہ بعض کہتے ہیں اس سے مراد عمل کی قوت واستطاعت ہے ان کے علاوہ بھی کچھ تفسیریں کی گئی ہیں۔اگر ان سے یہ سوال کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ بندے اور کسب کو الگ الگ مستقل حیثیتوں میں پیدا کرتا ہے؟ تو کہتے ہیں کہ نہیں اللہ تعالیٰ کسب وفعل کو اس طرح پیدا کرتا ہے کہ بندے کا اس میں ارادہ واختیار نہیں ہوتا نہ تو مستقل اور نہ ہی مشارکت کے طور پر۔اگر ہم بنظر غائر دیکھیں تو اشاعرہ کا یہ قول بھی جبریہ کی طرح ہی ہے کسب کا لفظ صرف ایک واسطے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے تا کہ ان پر جبریہ کا نام نہ لگے۔بہت سے بڑے اشاعرہ نے اس کسب والے معاملے سے انکار کیا ہے جیسا کہ امام الحرمین الجوینی ہیں وہ کہتے ہیں کہ بندے کو درحقیقت اپنے افعال پر قدرت حاصل ہے ان کا یہ قول اہلسنت کے قول کے قریب ہے۔اشاعرہ کا ایک اور قول بھی جبریہ کے مطابق ہے وہ کہتے ہیں کہ اسباب ونتائج میں باہمی کوئی تعلق نہیں ہے اسباب کا نتائج سے تعلق یہ صرف دنیاوی مشاہدے تک محدود ہے۔یہ لازم نہیں ہے یہ صرف ہماری طرف سے ایک الزام ہے کہ اسباب ونتائج میں تلازم ہے لہٰذا آگ درحقیقت جلاتی نہیں مگر جب آگ بھڑکتی ہے تو جلانے کا عمل اللہ پیدا کرتا ہے۔اسی طرح پیاس پانی پینے سے نہیں بجھتی بلکہ یہ سیرابی اللہ پیدا کرتا ہے پانی پیتے وقت لہٰذا اسباب ونتائج میں تلازم نہیں ہے۔معجزہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سبب پیدا کرنے کے بعد نتیجہ پیدا نہ کرے۔حالانکہ اس طرح کی بات کرنا کائنات کیلئے مقرر کردہ اللہ کے قوانین کا انکار ہے جبکہ فرمان ہے۔﴿وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا﴾ آپ اللہ کے طریقوں میں تبدیلی نہیں پائیں گے۔(الاحزاب:٦٢) بلکہ یہ نظریہ تو اللہ کے پیدا کردہ اشیاء پر بھروسہ کرنے اور ان کی تاثیر وخوبیوں کو تسلیم کرنے سے روکنے والا نظریہ ہے۔اس طرح یہ جبر کی طرف لیجانے والا ہے۔اہلسنت اشاعرہ کے اس نظریہ کی مخالفت کرتے ہیں جہاں تک تعلق ہے سبب کے نتیجے کا اہلسنت کہتے ہیں کہ اللہ نے اشیاء پیدا کی ہیں اور ان اشیاء میں خصوصیات رکھی ہیں وہ خصوصیات ان اشیاء کے ساتھ لازم ہیں ان سے اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔اللہ جب چاہے ان اثرات کو روک دے اور سبب کا نتیجہ برآمد نہ ہو تو یہ معجزہ کہلاتا ہے۔ورنہ عمومی حالت میں نتیجہ سبب کا ہی برآمد ہوتا ہے اللہ کا طریقہ تبدیل نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ اللہ نے مؤمنوں کو قرآن میں حکم دیا ہے کہ وہ زمین میں چل پھر کر دیکھ لیں کہ نافرمانوں کا انجام کیا بنا؟اللہ نے ہر چیز پیدا کی ہے اور سبب کا نتیجہ ہوتا ہے ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے اس لیے کہ اسباب اور ان کے نتائج بھی اللہ ہی پیدا کرنے والا ہے۔اللہ کی قدرت کے بغیر کسی مخلوق میں کوئی خاصیت یا تاثیر پیدا ہی نہیں ہوسکتی۔

پر پیدا کیا ہے۔ (ضحی الاسلام احمد امین:۳/۵۸)

یوں انہوں نے ارادہ اور قدرت کو اپنے تصورات کے مطابق بیان کیا ہے اور اللہ کے عدل وارادہ کو انسانی عدل وارادہ پر قیاس کیا۔ معتزلہ جس تشبیہ خالق مع مخلوق سے بچنا چاہتے تھے اس میں خود ہی مبتلا ہوگئے۔ اس بارے میں حق وہی ہے جسے اہلسنت نے اختیار کیا ہے کہ انہوں نے اللہ کے ارادے کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے ایک ارادۂ کونیہ اور دوسرا ارادۂ شرعیہ۔

ارادہ کونیہ سے مراد ہے اللہ کا وہ ارادہ جس کے تحت کائنات میں تمام افعال ہو رہے ہیں چاہے وہ اچھے ہوں یا برے اسی ارادے کے تحت کائنات اللہ کے مقرر کردہ مقاصد کی طرف رواں دواں ہے۔

ارادہ شرعیہ اس سے مراد شرعی امر و نہی ہے۔(الفتاویٰ ابن تیمیہؒ:۱۰/۲٤)

اس تقسیم سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے، کہ اللہ اطاعت کو پسند کرتا ہے اس سے راضی ہوتا ہے اور اسی کا ارادہ کرتا ہے۔ کفر، فسق اور نافرمانی کو ناپسند کرتا ہے اس کا ارادہ نہیں کرتا۔ اللہ کی رضامندی و پسندیدگی ارادہ شرعی کے دائرے میں آتے ہیں یعنی اچھے کام کا شرعاً حکم اور معصیت کی ناپسندیدگی اور اس پر ناراضگی یہ بھی ارادہ شرعیہ کے تحت آتے ہیں۔ یہ ہے شرعی لحاظ سے کسی قبیح فعل سے رک جانا۔ معتزلہ و جبریہ نے ان دونوں قسم کے ارادوں کو باہم خلط ملط کر دیا ہے۔

جبریہ نے ارادہ و مشیئت کو ارادہ کونیہ تک منحصر کر دیا اور ارادہ شرعیہ کا انکار کر ڈالا اس طرح انہوں نے افعال کو بندوں کے ساتھ اسی طرح لازم قرار دیدیا جس طرح جمادات کے افعال ہیں۔

معتزلہ قدریہ نے ارادہ کو صرف شرعی ارادہ تک محصور کر کے ارادہ کونیہ کا انکار کیا انہوں نے اس بات کا انکار کر دیا کہ اللہ اپنے کافر و نافرمان بندوں کے افعال کا ارادہ کرتا ہے نیز انہوں نے شر پیدا کرنے کی اللہ کی قدرت کا انکار کر ڈالا اسی وجہ سے انہوں نے اللہ کی وہ محبت اور رضامندی جو شرعی ارادے کے ساتھ لازم ہے اسے ارادہ کونیہ، کہ جس کے بغیر کائنات میں کچھ نہیں ہوسکتا خلط کر دیا اس خلط کی وجہ سے انہوں نے محبت، رضامندی اور ارادے کو ایک ہی چیز بنا ڈالا اب ان کے مطابق جو شخص کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اس کام کو پسند کرنے والا ہوتا ہے اور اس پر راضی ہوتا ہے اسی طرح برعکس سمجھنا چاہیے حالانکہ محبت و رضامندی اور ارادہ و مشیئت میں فرق ہے اس کی مثال یوں ہے کہ ایک روزہ دار روزے کی حالت میں پانی کو پسند کرتا ہے مگر اس کے پینے کا ارادہ نہیں کرتا صرف ارادہ کرنا پسندیدگی و محبت کی نشانی نہیں ہوتی بلکہ بعض مرتبہ لفظ ارادہ لغت میں محبت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

((يريد االمرء ان يعطى مناه ويأبى الله الا ما ارادا))

(انسان چاہتا ہے کہ اس کی آرزو پوری ہوجائے مگر اللہ وہی کرتا ہے جو چاہتا ہے)

یہاں ارادہ محبت و پسندیدگی کے معنی میں مستعمل ہے۔ صرف ارادے کے معنی میں نہیں ہے۔ جیسا کہ اللہ کا ارادۂ کونیہ ہوتا ہے۔(ايثار الحق لابن المرتضى:٢٥٤)

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى (الانعام:٣٥)

اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ہدایت پر جمع کر لیتا۔

وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا(الانعام:١٢٥)

اللہ جسے گمراہ کرنا چاہے اس کا سینہ تنگ کر دیتا ہے۔

وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰهَا(السجدة:١٣)

اگر ہم چاہتے تو ہر شخص کو ہدایت دیتے۔

اس طرح کی دیگر آیات بھی ہیں۔ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہتے ہیں میں نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((کتب اللّٰہ مقادیر الخلائق قبل ان یخلق السمٰوٰت والارض بخمسین الف سنة قال وعرشه علی الماء))

''اللہ نے مخلوق کی تقدیریں زمینوں اور آسمانوں کی تخلیق سے پچاس ہزار سال پہلے لکھیں اس کا عرش پانی پر تھا۔''(صحیح مسلم)

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((المؤمن القوی خیر واحب الی اللّٰہ من المؤمن الضعیف وفی کل خیراحرص علی ما ینفعك واستعن باللّٰہ ولاتعجز وان اصابك شیئ فلا تقل لو انی فعلت کان کذا وکذا ولکن قل قدراللّٰہ وماشاء فعل فان لو تفتح عمل الشیطان))

''قوی مؤمن ضعیف مؤمن سے اللہ کو زیادہ پسند ہے اور ہر ایک میں بھلائی ہے۔اس چیز کی کوشش کر جس میں تیرا فائدہ ہو اور اللہ سے مدد طلب کر اور عاجز مت ہونا۔اگر تمہیں کوئی نقصان پہنچے تو یہ مت کہنا اگر میں فلاں کام کرتا تو اس طرح نہ ہوتا بلکہ یہ کہو کہ اللہ نے جو مقرر کیا تھا وہ اس نے کیا۔لفظ ''اگر'' شیطانی کام کا دروازہ کھول دیتا ہے۔''(مسلم کتاب القدر)

صحیح مسلم میں جبریل علیہ السلام کی حدیث میں اس طرح کے الفاظ ہیں:

((قال فاخبرنی عن الایمان قال ان تؤمن باللّٰہ وملائکته وکتبه ورسله والیوم الآخر وتؤمن بالقدر خیره وشره))

''جبریل علیہ السلام نے کہا اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے ایمان کے بارے میں بتایئے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو ایمان لائے اللہ پر اس کے فرشتوں پر،اس کی کتابوں پر،آخرت کے دن پر اور تقدیر پر چاہے اچھی ہو یا بری۔''

صحیحین میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم میں سے ایک شخص جنتیوں کا عمل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے کہ پھر اسے پالیتا ہے جو کچھ پہلے سے کتاب میں لکھا ہوا ہے تو یہ شخص جہنمیوں والا عمل کر لیتا ہے اور جہنم میں چلا جاتا ہے۔اور تم میں سے ایک شخص جہنمیوں والا عمل کرتا رہتا ہے یہاں تک اس کے اور جہنم کے درمیان ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے کہ پھر اس کو پالیتا ہے جو کچھ پہلے سے کتاب (تقدیر) میں لکھا ہوا ہے تو یہ جنتیوں کا عمل کر لیتا ہے اور جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔(صحیح بخاری:٨٠٦،الاذان باب فضل السجود)

مسلم میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا مذکور ہے آپ کہتے تھے:

((اللھم انی أسألك الھدی والتقی والعفاف والغنی))

''اے اللہ میں تجھ سے ہدایت،حفاظت عافیت اور قناعت طلب کرتا ہوں۔''

ابوداؤد اور ترمذی میں ہے:((اللھم اھدنی فیمن ھدیت،وتولنی فیمن تولیت،وعافنی فیمن عافیت،وبارك لی فیما أعطیت،وقنی شرماقضیت انك تقضی ولا یقضی علیك،فانه لایذل من والیت تبارك وتعالیت))

اے اللہ مجھے ہدایت دے ان لوگوں میں جنہیں تو نے ہدایت دی ہے اور میری مدد کر ان لوگوں میں جن کی تو نے مدد کی ہے اور مجھے عافیت دے ان لوگوں میں جن کو تو نے عافیت دی ہے۔اور جو کچھ تو نے مجھے دیا ہے اس میں میرے لئے برکت دے۔مجھے بچا اس چیز کے شر سے جس کا تو نے فیصلہ کیا ہے۔تو فیصلہ کرتا ہے اور تیرے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا اور جس کا تو دوست بن جائے اسے کوئی ذلیل نہیں کر سکتا تو بابرکت اور بلند ہے۔

(ترمذی نے حسن اور البانی واحمد شاکر رحمہ اللہ نے صحیح کہا۔شرح اصول اعتقاد اھل السُّنَّة،ھامش:٦٤٨/٣)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی آثار منقول ہیں جو ان احادیث کے مفہوم کی تائید کرتے ہیں۔ابوبکر صدیق،عمر بن خطاب،علی،عثمان،عبداللہ بن مسعود،عبدالرحمٰن بن عوف،ابن عباس،حذیفہ بن یمان،ابی بن کعب رضی اللہ عنہم وغیرہ کبار صحابہ کے آثار موجود ہیں۔تابعین میں سے عمر بن عبدالعزیز،حسن بصری،مطرف بن عبداللہ الشخیر،محمد بن کعب،جعفر صادق،ربیعہ بن عبدالرحمٰن،قاسم بن محمد،سعید بن جبیر اور شعبی رحمہم اللہ وغیرہ بہت سے تابعی ہیں۔

(شرح اصول اعتقاد اھل السُّنَّة:٥٧٨/٣)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تقدیر کے اثبات کے بعد اس کے بارے میں بات کرنے سے منع کیا ہے جیسا کہ پیچھے بیان کردہ احادیث میں گزر چکا ہے۔احمد و ابن ماجہ کی

روایت ہے کہ عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: رسول صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس آئے جبکہ وہ لوگ تقدیر کے بارے میں تنازع کررہے تھے کوئی ایک آیت پیش کرتا تو دوسرا دوسری آیت پیش کرتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک ایسا سرخ ہوگیا جیسے اس پر انار نچوڑ اگیا ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تمہیں انہی باتوں کا حکم دیا گیا ہے؟ کیا تمہیں یہی ذمہ داری دی گئی ہے کہ تم کتاب اللہ کی آیات کو باہم ٹکراؤ؟ جس کا تمہیں حکم ملا ہے اسی میں غور کرو اس کی اتباع کرو اور جس سے منع کیا گیا ہے اس سے اجتناب کرو۔ (الحدیث حسن وصححه احمد شاکر رحمه الله، راجع هامش شرح اصول اعتقاد اهل السُّنَّة: ٦٢٧/٣)

طاؤس رحمہ اللہ کی ایک مرتبہ معبد جہنی سے ملاقات ہوئی۔ طاوس رحمہ اللہ نے کہا: تم معبد ہو؟ اس نے کہا: ہاں۔ طاؤس رحمہ اللہ لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ یہ معبد ہے اس کی توہین کیا کرو۔

حسن رحمہ اللہ معبد جہنی کے ساتھ بیٹھنے سے منع کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اس کے ساتھ مت بیٹھو۔ یہ گمراہ ہے اور گمراہ کرنے والا ہے۔ (شرح اصول اعتقاد اهل السُّنَّة ٦٣٧/٣۔

بندے اپنے افعال کے خالق ہیں یا نہیں اس بارے میں اہل سنت کا موقف اس فرق سے واضح ہوجاتا ہے جو انہوں نے ارادۂ کونیہ اور ارادۂ شرعیہ کے درمیان کیا ہے اور جو فرق ارادہ ومحبت کے معنی کے درمیان کیا ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے کہ: ﴿اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ﴾ ''اللہ ہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے۔'' (الزمر: ٦٢) مگر وہ اللہ خاص شر پیدا نہیں کرتا بلکہ انسان کسی چیز کو اس کے نتائج وعواقب کی وجہ سے شر سمجھتا ہے یا ایک چیز ایک لحاظ سے شر ہوتی ہے مگر دوسرے لحاظ سے وہ نفع رساں ہوتی ہے لہٰذا کسی چیز کے خیر یا شر ہونے کا فیصلہ تب کیا جاسکتا ہے جب اس پر تفصیل سے تحقیق کی جائے۔ کسی چیز کی مکمل تحقیق اور اس کے دنیوی واخروی فوائد ونقصان کی مکمل حقیقت صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اس لیے کہ وہی ذات ہے کہ جس کا علم مکمل ہے اور جو ہر چیز پر محیط ہے جبکہ انسان کا علم ناقص ہے اس کی معلومات محدود ہیں۔ اس لیے وہ کسی چیز کے شر کو دیکھتا ہے تو اس چیز کے فوائد اس کی نظروں سے اوجھل رہتے ہیں جس کی وجہ سے وہ اس چیز کو محض شر ہی سمجھتا ہے۔ اور یہ خیال کرتا ہے کہ اس میں نفع ہے ہی نہیں حالانکہ حقیقت کچھ اور ہوتی ہے۔ یہ لوگ (معتزلہ) کہتے ہیں کہ بعض چیزیں شر ہی شر ہوتی ہیں ان میں خیر ہوتا ہی نہیں اس کے لیے یہ لوگ ابلیس کی مثال دیتے ہیں حالانکہ بات یہ نہیں ہے اس لیے کہ اگر شیطان کافروں کیلئے شر ہے تو اس حد تک کہ اس کا کام صرف وسوسہ ڈالنا ہے جبکہ کافروں کے برے اعمال انہی کی طرف منسوب ہوں گے اور شیطان کی اطاعت انہی کا عمل شمار ہوگا۔ جبکہ یہی ابلیس مؤمنوں کیلئے خیر کا سبب بنتا ہے کہ جب مؤمن اس کا مقابلہ کرتے ہیں اس کی اطاعت سے اجتناب کرتے ہیں تو انہیں پختہ ایمان نصیب ہوتا ہے اور اس ایمان کا انہیں جنت اور نعمتوں کی صورت میں اجر ملتا ہے۔ اسی طرح اگر مؤمن بندہ گناہ کے کام کرتا ہے تو اس میں اس کو فائدہ ہوجاتا ہے کہ وہ جب توبہ کرتا ہے تو وہ برائی نیکی میں بدل جاتی ہے اور توبہ اس کیلئے جنت میں داخل ہونے کا سبب بن جاتا ہے جیسا کہ احادیث میں آتا ہے: جب کوئی بندہ گناہ کرتا ہے تو اس کی وجہ سے جنت میں داخل ہوتا ہے کہ گناہ کرتا رہتا ہے توبہ کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ توبہ اس کو جنت میں داخل کرادیتی ہے۔ اسی طرح جو مصیبتیں انسان کو پہنچتی ہیں اور انسان ان پر صبر کرتا ہے تو وہ مصیبتیں بھی اس کیلئے نعمت بن جاتی ہیں اس لیے کہ ثواب کا سبب بنتی ہیں جیسا کہ حدیث میں آتا ہے: ''اگر انسان کو آسانی پہنچتی ہے وہ اس پر شکر کرتا ہے تو یہ اس کیلئے خیر ہے'' بلکہ اس کیلئے نعمت اور خوشی کی مانند ہے جو کہ خود انسان کی آزمائش کا ذریعہ ہیں۔

جیسا کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَ نَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ O وَ اَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ

(الفجر: ١٥،١٦)

''جب انسان کو اس کا رب آزماتا ہے اور اسے نعمت دیدیتا ہے تو وہ کہتا ہے میرے رب نے مجھے عزت دی اور جب (دوسری طرح) آزماتا ہے اس کا رزق تنگ کردیتا ہے تو انسان کہتا ہے میرے رب نے مجھے رسوا کردیا۔'' (الفتاویٰ ابن تیمیہ رحمه الله: ٢٠٤/٨)

تولد کے موضوع میں ہم ان نظری مسائل میں زیادہ غور وخوض نہیں کرنا چاہتے کیونکہ جب ہم ثابت کرچکے ہیں کہ اللہ ہر چیز کا خالق ہے تو اس میں تولد وغیرہ سب آ گئے۔ ہمیں صرف یہ یاد رکھنا چاہیے کہ بندے سے سوال کس چیز کا ہوگا؟ اس کے اس فعل کا جس کا اچھا یا برا نتیجہ برآمد ہوتا ہے اسی حساب سے اس کو جزا وسزا ملے گی۔ اعمال میں نیت کا اعتبار بہرحال ہوتا ہے مگر جزا وسزا اس عمل پر ملے گی جو انسان نے کیے ہوں۔ خواہ اس نے اپنے عمل سے کسی کو نقصان پہنچانے کا قصد کیا ہو یا نہ کیا ہو ضرر اگر کسی کو پہنچا ہے تو اس عمل کی سزا ضرور ملے گی۔ یہ دنیاوی معاملات میں ہے۔ جہاں تک تعلق ہے آخرت کا تو وہاں یہ تحقیق وتفتیش ہوگی کہ نقصان رساں عمل

کا اس نے ارادہ کیا تھا؟ نیت کی تھی؟ یا نہیں۔ اگر نیت کی تھی تو پھر سزا ملے گی اور جس کو تکلیف دی گئی تھی اس کیلئے بدلہ دلایا جائے گا۔ اگر تکلیف پہنچانے کی نیت نہیں تھی تو اللہ کی معافی اور اس کی رحمت وسیع ہے (اس کی بخشش ہو جائے گی اگر اللہ چاہے گا)۔ اس کی مثال ہم یوں دے سکتے ہیں کہ ایک آدمی نے ایسے راستے کے بیچ میں کنواں کھود دیا جس پر بہت سے لوگ گذرتے رہتے ہوں اور اس کنویں میں کوئی شخص گر کر مر گیا تو کھودنے والے سے دیت لی جائے گی اگرچہ اس نے کسی کو گرانے یا مارنے کیلئے نہیں کھودا تھا مگر نقصان تو ہوا اور اس کا سبب کھودنے والا شخص بنا اس لیے سزا کا مستحق قرار پایا، یہ ہے دنیاوی لحاظ سے سزا دینے کا قانون۔ اسی طرح ہم اگر مثلاً استری خریدتے ہیں تو کمپنی سے اس بات کی گارنٹی لیتے ہیں کہ یہ کپڑے نہیں جلائے گی اور کمپنی یہ ضمانت بھی دیتی ہے تو اگر کپڑا جل جاتا ہے تو کمپنی رقم ادا کرتی ہے حالانکہ اس کا مقصد استری بنانے سے کسی کا کپڑا جلانا نہیں تھا اور یہ گارنٹی وہ اس لیے دیتی ہے تاکہ اس کا مال فروخت ہو نہ کہ لوگوں کے کپڑے جلیں مگر نیت نہ ہونے کے باوجود وہ تاوان ادا کرتی ہے۔ (الموفقات للشاطبی رحمہ اللہ: ۲/۳۲۳)

یہ ایک وسیع موضوع ہے جس پر طویل گفتگو مزید کی جاسکتی ہے مگر ہم تفصیلات میں جانے کے بجائے صرف اتنی سی توجہ دلانا چاہتے تھے کہ بدعتی فرقہ نے مسلمانوں کو بلا فائدہ ایک عام سے مسئلہ میں الجھانے کی کوشش کی تھی جس کا ازالہ اختصار کے ساتھ ہم نے کر دیا طویل تفصیلات کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

④ نظریہ صالح واصلح (بہتر اور بہترین یا مناسب اور مناسب ترین کا نظریہ)

معتزلہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بھلائی کے کام کرتا ہے اور انہی کا ارادہ کرتا ہے۔ نہ برائی کرتا ہے اور نہ اس کا ارادہ۔ بلکہ بعض معتزلہ کہتے ہیں کہ اللہ برائی کرنے کی طاقت ہی نہیں رکھتا۔ اللہ اپنے بندوں کی بھلائی کے کام کرتا ہے بلکہ اس پر واجب ہے کہ وہ اس سے بھی زیادہ بہتر اور زیادہ فائدے والا کام کرے۔ (معاذ اللہ ثُمّ معاذ اللہ) اگر اللہ ایسا کام کرے جس سے بندوں کو تکلیف ونقصان پہنچے تو یہ ظلم ہوگا اور ظلم کی ہم نے اللہ سے نفی کر دی ہے کہ وہ ظلم نہیں کرتا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ صرف وہی کام کرتا ہے جس میں بندوں کا فائدہ ہوتا ہے اگر ایسا نہ کرے تو وہ بندوں پر ظلم کرنے والا ہوگا حق بات تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ پر کسی قسم کا فعل واجب ولازم نہیں کر سکتا یہ معتزلہ نے بہت بری بات کہہ دی بہت بڑی بات ہے جو وہ کہہ رہے ہیں یہ اس لیے کہتے ہیں کہ انہوں نے اللہ کی قدر نہیں پہچانی۔ اگرچہ ان کا دعویٰ ہے کہ یہ عدل وتوحید کے علمبردار ہیں۔ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے: ﴿یفعل مایشاء ویختار﴾ ﴿الاله الخلق والأمر﴾ ''تخلیق بھی اسی کا کام ہے اور حکم بھی'' ﴿لَا يُسْأَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْأَلُوْنَ﴾ ''وہ جو کچھ کرتا ہے اس کے بارے میں اس سے سوال نہیں کیا جاسکتا اور ان لوگوں سے سوال کیا جائے گا۔'' (الانبیاء: ۲۳) اللہ کی حکمت بالغہ اور رحمت کا تقاضا ہے کہ وہ کوئی بھی کام بغیر حکمت وعلت مقصودہ کے نہ کرے اس لیے کہ اللہ عبث وبے کار کاموں سے پاک ہے ﴿اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا﴾ ''کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم نے تمہیں بے فائدہ وبے مقصد پیدا کیا ہے؟'' (المؤمنون ۱۱۵) اللہ نے ہر چیز حق پیدا کی ہے اور حق حکمت سے خالی نہیں ہوتا اہل سنت والجماعت کا اس بات پر اجماع واتفاق ہے۔ (الموافقات للشاطبی رحمہ اللہ: ۲/۶۔ ایثار الحق۔ شفاء العلیل لا بن القیم رحمہ اللہ)

اہل سنت کہتے ہیں کہ اللہ کے احکام مصلحتوں پر مبنی ہیں جن میں انسانوں کی مصلحت کا خیال بالعموم رکھا جاتا ہے اگرچہ یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ مصلحتیں ایک ایک فرد بشر کیلئے ہو اور ہر حال میں ہو۔ ❶

کیونکہ اللہ کے احکام میں صرف دنیاوی مصلحتوں کا خیال نہیں رکھا جاتا بلکہ ان میں اخروی فوائد کا بھی لحاظ کیا جاتا ہے۔ اسی لیے انسانی عقل ان اسرار وحکمتوں کو تفصیل کے ساتھ معلوم کرنے سے قاصر ہے۔

معتزلہ کہتے ہیں کہ اللہ پر لازم ہے کہ وہ ان مصلحتوں کا لحاظ رکھے، ان کو مدنظر رکھے یہ اس کے عدل کا تقاضا ہے۔ اہل سنت کہتے ہیں کہ یہ اللہ کا فضل اور احسان ہے کہ وہ

---

❶ اشاعرہ کہتے ہیں اللہ کے احکام میں کوئی حکمت نہیں ہوتی اس لیے کہ حکمت ومصلحت کا لحاظ وہ لوگ کرتے ہیں جو مجبور ہوں جبکہ اللہ تو تمام جہانوں سے بے پرواہ ہے لہٰذا اس کے افعال کو کسی علت یا مصلحت پر مبنی قرار دینا صحیح نہیں اس طرح انہوں نے اللہ کی اس حکمت کی نفی کر دی جو اسلام میں بنیادی اہمیت کی حامل ہے ﴿حکمة بالغة فما تغن النذر﴾ (القمر) ''(اللہ کی جانب سے اخبار واحکام) حکمت بالغہ ہیں مگر خبردار کرنے والوں سے انہیں کوئی فائدہ نہیں ہوا''۔ اشاعرہ ومعتزلہ میں اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ ایک فرقہ نے جب اللہ کی حکمت کو تسلیم کر لیا تو اس میں اتنا غلو کیا کہ اللہ کی حکمتوں کو تفصیلی طور پر عقل سے سمجھنے کا کام شروع کر دیا اور پھر اس مقصد کیلئے بہت ہی رکیک قسم کی باتیں کہہ دیں جو مناسب نہ تھیں۔ اس فرقے کے مقابلے پر دوسرے فرقے اشعریہ نے جب ان کا رد کیا تو اس میں انہوں نے اتنے غلو سے کام لیا کہ تمام حدیں پھلانگ ڈالیں اور اللہ کے احکام میں کسی بھی قسم کی حکمت ومصلحت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ دونوں فرقے غلو میں مبتلا ہو گئے جبکہ بہتر راستہ اعتدال کا ہے (جس پر اہل السنة قائم ہیں) (ایثار الحق: ۱۹۴)

احکام میں مصلحتوں کو مدنظر رکھتا ہے اور یہ اس کے عدل، حکمت، رحمت اور علم کا تقاضا ہے۔ یہاں دونوں نقطے ہائے نگاہ کی بنیاد پر دونوں گروہوں (معتزلہ اور اہل السنة) میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

⑤ کسی چیز کی اچھائی یا برائی عقلی مسئلہ ہے۔

سابقہ اصولوں کی طرح یہ بھی اہم ترین اصول ہے۔ بلکہ ہمارے خیال میں تو یہ اصول سب سے زیادہ خطرناک و نقصان دہ ہے اس لیے کہ معتزلہ اور ان کے متبعین اسی اصول کی بنیاد پر آثار و احکام کو عقل کی وجہ سے باطل طور پر رد کرتے رہے ہیں۔ مختصراً یہ قضیہ یوں ہے کہ کیا عقل تنہا یہ فیصلہ کرسکتی ہے کہ فلاں کام اچھا اور فلاں برا ہے؟ یا یہ کہ ایسے فیصلے کیلئے شریعت کی ضرورت ہے؟ کہ وہ ہمیں کسی عمل یا چیز کے حسن و قبح کے بارے میں بتائے۔ بالفاظ دیگر کیا اشیاء میں ایسی ذاتی صفات ہوتی ہیں کہ جن کے ذریعے سے عقل ان اشیاء کی اچھائی یا برائی کا فیصلہ کرسکے؟ اس قضیہ کی بابت معتزلہ کہتے ہیں کہ تنہا عقل تمام اشیاء کی اچھائیوں اور برائیوں کا ادراک کرسکتی ہے اس لیے کہ اشیاء میں ایسی ذاتی صفات ہوتی ہیں جو ان کی اچھائی یا برائی پر دلالت کرتی ہیں۔ مثلاً سچائی اچھی چیز ہے اور جھوٹ بری چیز ہے۔ اور عقل اس بات کا تنہا ادراک کرسکتی ہے یہاں تک کہ شریعت آنے سے پہلے ہی عقل نے اس کا فیصلہ کردیا تھا۔ شریعت آتی اسی لیے ہے کہ عقلی طور پر ثابت شدہ چیزوں کی تائید کرے، نہ کہ نئے سرے سے کسی چیز کو ثابت کرے۔ اس پر انہوں نے دو باتوں کی بنیاد رکھی ہے۔

① **توحید:** جو کہ سب سے بہتر کام یا چیز ہے اسی طرح کے دیگر اچھے و افضل امور یا برے کام ان کی اچھائی یا برائی کا فیصلہ امکانی طور پر عقل، انبیاء کی بعثت سے قبل کرسکتی ہے یہی وجہ ہے کہ انسان کو اس کے اچھے کام کی جزا اور برے کام کی سزا ملتی ہے۔ خواہ انبیاء نہ بھی بھیجے جاتے اور آسمانی کتب نازل نہ کی جاتی۔

(ارشاد الفحول، الشوکانی رحمه الله: ۲۸۷)

② **عقل کا فیصلہ:** اس بارے میں آخری فیصلہ ہوتا ہے کہ کون سی چیز اچھی ہے کون سی چیز بری، اسی لیے ان احادیث کو جن میں کس چیز کی اچھائی یا برائی کی خبر ہے عقل کی رو سے قبول یا رد کیا جاسکتا ہے بالفاظ دیگر عقل ہی یہ بتا سکتی ہے کہ کس چیز میں اچھائی اور مصلحت ہے اور کس میں برائی اور مفسدت۔

اگر ان کی عقل انہیں یہ بتاتی ہے کہ سوکر اٹھنے والے کیلئے پانی ہاتھ میں ڈالنے سے پہلے دھونا ضروری نہیں کیونکہ عقل اس کا تقاضا نہیں کرتی یا عقل میں یہ بات نہیں آتی تو یہ اسے رد کردیتے ہیں اگرچہ اس بارے میں صحیح حدیث موجود ہو۔ اسی طرح اگر ان کی عقل میں یہ بات نہیں آتی کہ اپنی بیوی سے مجامعت کرنے میں ثواب ہے تو یہ حدیث کو رد کردیتے ہیں یہ کہہ کر کہ عقل و فکر نے ان احادیث کو غلط ثابت کردیا ہے۔ (تاویل مختلف الحدیث، ابن قتیبة: ۱۸۱)

ان کے خیال میں عقل کبھی غلطی نہیں کرسکتی جبکہ احادیث و آثار کی صحت کا دارومدار عقل کے علاوہ بھی بہت سی چیزوں یا امور پر ہے ان کی موجودگی کے بغیر ان کی صحت کو تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

اس معاملہ میں اہل سنت حق پر قائم ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ بات حقیقت ہے کہ کچھ چیزیں ایسی ہیں کہ عقل ان کی اچھائی یا برائی کا ادراک کرسکتی ہے مثلاً کسی ڈوبتے کو بچانا عقل کے لحاظ سے اچھا کام ہے یہاں تک کہ کفار کے ہاں بھی اسے اچھا کام تسلیم کیا جاتا ہے اسی طرح احسان فراموشی عقل کے لحاظ سے بہت بری حرکت ہے کفار کے ہاں بھی اسے ناپسندیدہ تصور کیا جاتا ہے اصل اختلاف دو باتوں میں ہے۔

❶ شریعت سے قبل ان امور پر ثواب و عذاب مرتب ہونا۔ یہاں آکر معتزلہ نے ٹھوکر کھائی ہے۔ اہل سنت کہتے ہیں کہ ثواب و عذاب کا فیصلہ صرف شریعت آنے کے بعد ہوگا۔ یہ فیصلہ شریعت کرے گی۔ جیسا کہ اللہ کا فرمان ہے:

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا ۝ (الاسراء: ۱۵)

ہم کسی کو اس وقت تک عذاب نہیں کرتے جب تک رسول نہ بھیج دیں۔

یعنی عذاب و سزا اس وقت تک دینا صحیح نہیں ہے جب تک لوگوں کے پاس رسول نہ بھیج دیئے جائیں اور ان کے ذریعے سے لوگوں پر حجت نہ قائم کردی جائے اللہ نے بندوں کے بہانے ختم کردیئے ہیں، ان تک اپنے پیغامات پہنچادیئے ہیں اور ان پر حجت قائم کردی ہے رسولوں کے بھیجنے سے اور ان کی بعثت سے قبل میثاق اول کے ذریعے بھی اور جبکہ ان کو فطرت توحید و عبادت پر بھی پیدا کیا۔

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّکَ مِنْ بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُھُوْرِھِمْ ذُرِّیَّتَھُمْ وَاَشْھَدَھُمْ عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوْا بَلٰی O (الاعراف:۱۷۲)

''اور جب تیرے رب نے اولادِ آدم سے میثاق (عہد) لیا جب آدم کی پُشت سے اُن کی اولاد نکالی اور انہیں ان کی جانوں پر گواہ بنایا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا کیوں نہیں؟'' یہی ہے میثاق اول۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

((مامن مولود یولد علی الفطرة فأبواه یهودانه وینصر انه ویمجسانه))

''ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی، عیسائی اور مجوسی بناتے ہیں۔'' (درء التعارض ابن تیمیة رحمہ اللہ:۸/۲۵۹، صحیح مسلم، کتاب القدر)

یہ ہے میثاق فطرت:

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ O (النحل:۳۶)

ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے اجتناب کرو۔

اس طرح اللہ نے رسول بھیج کر حجت قائم کر دی: ﴿فللّٰه الحجة البالغة﴾ یہ اللہ کی رحمت و مہربانی ہے کہ وہ بندوں کا مواخذہ نہیں کرتا جب تک ان پر حجت قائم نہ کر دے اور ان کے سامنے دلائل کی راہ نہ واضح کر دے۔ اللہ نے یہ ذمہ داری مکمل طور پر پوری کر دی ہے۔ اور تمام لوگوں کے پاس رسول بھیج دیئے ہیں۔ ﴿لِّیَھْلِکَ مَنْ ھَلَکَ عَنْ بَیِّنَةٍ وَّیَحْیٰی مَنْ حَیَّ عَنْ بَیِّنَةٍ﴾ ''جو ہلاک ہونا چاہے تو دلیل سے اور جو زندہ رہنا چاہے تو دلیل سے۔'' (الانفال:۴۲)

❷ کچھ امور ایسے ہیں جن کی اچھائی یا برائی کا ادراک عقل سے نہیں کیا جاسکتا مثلاً وہ سچ جو نقصان دہ ہو اور وہ جھوٹ جو نفع رساں ہوں۔ ❶

لہٰذا اس طرح کے امور شریعت کے احکام اور وضاحت کے محتاج ہیں شریعت ان مختلف امور کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کرتی ہے اور دنیا و آخرت کو ایک ہی میدان بنا دیتی ہے جس میں کسی عمل کی اچھائی یا برائی صحیح طور سے سامنے آتی ہے قطع نظر اس سے کہ وہ عقلاً اچھی معلوم ہوتی ہیں یا بری۔ معتزلہ نے یہی خلط کیا ہے کہ جو چیز بظاہر فائدہ مند اور لذیذ نظر آتی ہے وہ شرعی طور پر بھی اچھی ہونی چاہیے اور جو چیز بظاہر نقصان دہ ہے وہ شریعت کی نظر میں بھی بہر حال قبیح ہونی چاہیے۔!

کیونکہ خود عقل بظاہر مفید چیزوں میں مصلحت اور قبیح چیزوں میں مفسدت دیکھنا پسند کرتی ہے۔

(الاحتجاج بالقدر ابن تیمیة رحمہ اللہ:۱۱، الموافقات للشاطبی رحمہ اللہ:۲/۲۵)

یہی وجہ ہے کہ جب شریعتیں نازل ہوئیں تو بعض امور کو برقرار رکھا گیا جن پر اہل جاہلیت متفق و متحد تھے اور انہیں اچھا سمجھتے تھے جیسا کہ حلف الفضول اسی طرح بعض اشیاء سے ان کے ضرر و مفسدت کی وجہ سے منع کر دیا گیا تاہم ان کی عقول ان اشیاء کے نقصانات کا ادراک نہ کر سکی تھیں جیسا کہ کئی مردوں کا ایک عورت سے جنسی تعلق اور جب اسے حمل ٹھہر جاتا تو پھر وہ عورت جسے چاہتی اس بچے کا باپ قرار دیتی۔ اور جیسا کہ استبضاع کا عمل (اس کا معنی یہ ہے کہ کسی کے ہاں بچے پیدا نہ ہوتا اور اس کا سبب مرد کی نااہلی ہوتی تو عورت کسی اور مرد سے مل لیتی تھی اس کو نیوگ کہتے ہیں اسی کو استبضاع بھی کہتے ہیں۔ مترجم)

﴿تیسرا اصول﴾ وعد و عید

﴿چوتھا اصول﴾ المنزلة بین المنزلتین

---

❶ اشاعرہ نے معتزلہ کی مخالفت کی ہے وہ کہتے ہیں کہ عقل یہ فیصلہ نہیں کر سکتی کہ اچھائی کیا ہے برائی کیا ہے اس لیے کہ کسی چیز کے اچھے یا برے ہونے کا فیصلہ شریعت کرتی ہے۔ اللہ کیلئے ممکن ہے کہ وہ سچائی کی مذمت کرے اور جھوٹ کی تعریف کرے گناہ گاروں کو جنت اور نیکوکاروں کو جہنم میں ڈالدے۔ لیکن صرف اس نے اپنے ارادے اور مشیئت سے ایسا کیا ہے کہ نیکوکاروں کیلئے جنت اور گناہگاروں کیلئے جہنم کا فیصلہ کیا۔ اور جھوٹ کی مذمت اور سچ کی تعریف کی ہے۔ اور فرشتوں اور رسولوں کی مدح اور ابلیس اور شیطانوں کی مذمت کی ہے یہ اس لیے کہ اللہ نے جب اشیاء پیدا کیں تو ان میں ایسی صفات نہیں رکھیں جن کے ذریعے سے ان کی اچھائی برائی میں تمیز ہو سکے۔ اس طرح اشاعرہ اللہ تعالیٰ کے افعال میں حکمت کی نفی کے مرتکب ہوئے۔ جب کہ اہل السنۃ ہر دو گروہوں (معتزلہ اور اشاعرہ) کے درمیان عدل پر قائم ہیں۔

معتزلہ کے ہاں منزلة بین المنزلتین کی اصطلاح سے مراد مرتکب کبیرہ ہے جو اسلام اور کفر کے درمیان ایک تیسرے درجے پر ہوتا ہے (نہ مسلمان نہ کافر)۔ یہی وہ بنیادی مسئلہ ہے جس کی وجہ سے معتزلہ فرقہ دیگر بدعتی فرقوں سے علیحدہ شناخت کا حامل بنا اور اسی مسئلے کی وجہ سے انہیں معتزلہ (علیحدہ ہونے والا) قرار دیا گیا۔

بغدادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> واصل بن عطاء نے ایک نئی بات ایجاد کی جس کی وجہ سے وہ تمام فرقوں سے خارج وعلیحدہ ہوا وہ بات یہ تھی کہ امت محمد یہ علی صاحبها الصّلوة والسلام سے فسق کرنے والا شخص نہ تو مؤمن کہلائے گا نہ کافر۔ اس نے فسق کو کفر اور اسلام کے درمیان ایک تیسرا درجہ قرار دیدیا۔ جب حسن بصری رحمہ اللہ کو واصل کی اس بات کا علم ہوا تو انہوں نے واصل کو اپنی مجلس سے اٹھا دیا۔ واصل بصرہ کی مسجد کے ایک ستون کے پاس جا کر علیحدہ بیٹھ گیا اس کے پاس اس کی گمراہی میں اس کا ساتھ دینے کے لیے عمرو بن عبید بن باب بھی آ کر بیٹھ گیا۔ اس دن لوگوں نے ان کے بارے میں کہا (انهما قد اعتزلا قول الامة) کہ یہ دونوں امت کے قول سے علیحدہ ہو گئے اس کے بعد سے ان دونوں کو اور ان کے پیروکاروں کو معتزلہ (علیحدہ ہونے والے) کہا جانے لگا۔
>
> (الفرق بین الفرق:۱۱۸، بغدادی، والمجموع الفتاوی ابن تیمیةؒ:۷/۴۸۴)

معتزلہ نے خوارج کی موافقت کی ہے جنھوں نے کہا تھا کہ مرتکب گناہ کبیرہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ یہ بھی مرتکب کبیرہ فاسق کے مخلد فی النار ہونے کے قائل ہیں تاہم اسے کافر قرار نہیں دیتے بلکہ کفر واسلام کے درمیان ایک تیسرا درجہ فسق کا قرار دیتے ہیں۔ (مقالات اشعری:۲۷۴)

ایمان کے بارے میں خوارج ومعتزلہ کہتے ہیں کہ ایمان قول اور عمل کا نام ہے مگر یہ ایک ناقابل تقسیم اکائی ہے کہ نہ اس میں اضافہ ہوتا ہے نہ کمی اگر اس کا ایک جزء بھی ساقط ہو جائے تو پورا ایمان ساقط ہو جاتا ہے۔ (فتاوی ابن تیمیةؒ:۷/۵۱۰)

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: خوارج اور معتزلہ کا کہنا ہے کہ فرمانبرداری اور اطاعت سب ایمان میں سے ہیں۔ پس جب ایمان کا کوئی حصّہ چلا جاتا ہے (یعنی کوئی نافرمانی واقع ہوتی ہے) تو سارا ایمان ضائع ہو جاتا ہے (کیونکہ ان کے نزدیک ایمان ایک ناقابل تقسیم اکائی ہے) اسی بناء پر وہ کہتے ہیں کہ مرتکب کبیرہ غیر مؤمن (یعنی کافر) ہوتا ہے۔ (المجموع الفتاوی ابن تیمیةؒ:۲۲۳)

ان کو یہ غلط فہمی اس لئے ہوئی کہ وہ ایمان کو ان اجزاء سے مرکب مانتے ہیں جو کہ ایمان کے افعال ہیں اگر ان میں سے ایک جزء زائل ہو جاتا ہے تو ان کے نزدیک ایمان کی حقیقت مکمل طور پر زائل ہو جاتی ہے جیسا کہ دس عدد ہے اگر اس میں سے ایک بھی کم ہو تو یہ نو ہو جاتا ہے اسے دس نہیں کہہ سکتے۔

(فتاوی ابن تیمیةؒ:۷/۵۱۱)

اپنی اس بات یا اصول کے لیے معتزلہ نے اللہ کے اس فرمان کو دلیل بنایا ہے۔

> وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا (النساء:۱۳)
>
> جس نے اللہ ورسول کی نافرمانی کی اور اللہ کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کیا اس کیلئے جہنم کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔

نافرمان ہمیشہ کیلئے جہنمی ہے اس آیت سے یہی ثابت ہوتا ہے اگرچہ وہ کافر بھی نہیں اور مؤمن بھی نہیں ہے۔ اس آیت کو انہوں نے اپنی سمجھ کے مطابق اپنے اس اصول کیلئے دلیل بنایا ہے ان کا خیال یہ ہے کہ یہ سزا اس کیلئے ہے جو توبہ نہ کرے، گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرے اور توبہ کے بغیر مر جائے اگر گناہ کے بعد توبہ کی تو اللہ تعالیٰ اس کا گناہ معاف کر دے گا معتزلہ بغداد اس معافی کو اللہ کا احسان اور فضل کہتے ہیں جبکہ بصرہ کے معتزلہ اسے اللہ کی لازمی ذمہ داری قرار دیتے ہیں! (مذاهب الاسلامیین لبدوی:۳۷۱)

دوسری بات یہ لوگ اس اصول کے تحت کرتے ہیں کہ اللہ اپنے وعدے اور وعیدوں کو پورا کرنے کا پابند ہے۔ قرآن میں اس نے اگر اچھائی کے بدلے میں اچھائی کا وعدہ کیا ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اس وعدے کو پورا کرے اور بندے کو اچھا بدلہ دے۔ اگر برے عمل پر سزا دینے کا وعدہ کیا ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ ایسا کرے۔ اللہ نے مؤمنوں سے جنت کا وعدہ کیا ہے تو وہ ضرور پورا کرے گا۔ اسے ایسا کرنا بھی چاہئیے اس لیے کہ جس طرح وعدے کی خلاف ورزی بری بات ہے اس طرح وعید کی خلاف ورزی بھی قابل مذمت ہے۔

☆ اہل سنت کا عقیدہ:

اہل سنت کا عقیدہ ان کے خلاف ہے وہ کہتے ہیں کہ ایمان قول وعمل کا نام ہے اس میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے اور اس پر اہل سنت کا اجماع ہو چکا ہے۔ جب کوئی انسان موحد بن جاتا ہے تو اس میں ایمان جڑ پکڑ لیتا ہے جب وہ اطاعت کے کام کرتا ہے تو اس کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے اور جب معصیت کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کے ایمان میں کمی واقع ہوتی ہے۔ گناہ کبیرہ کا ارتکاب اسے دائرۂ ایمان سے دائرہ اسلام میں منتقل کر دیتا ہے۔

جیسا کہ حدیث میں آتا ہے: ایسا نہیں ہوسکتا کہ زنا کرنے والا زنا کرے اور وہ مؤمن بھی ہو۔

(فتاوی ابن تیمیہؒ: ۷/۳۱)

کفر تک وہ صرف اس صورت میں جاتا ہے جب کوئی ایسا عمل کرے جو کافر بنا دینے والا ہو اور اس کی توحید کو جڑ سے ختم کرنے والا ہو۔ اللہ نے اپنے حکم میں عدل سے کام لیا ہے۔ جس کی اچھائیاں اس کی برائیوں سے زیادہ ہوئیں تو اللہ کے حکم سے وہ نجات پا جائے گا اور جس کی برائیاں اس کی اچھائیوں سے زیادہ ہوئیں تو اللہ موحدین کو جہنم میں ڈالدے گا تا کہ انہیں گناہوں سے پاک کر دے پھر وہاں سے نکال دے گا جب وہ اپنے گناہوں کی سزا بھگت لیں گے۔ ❶

مرتکب کبیرہ اللہ کی مشیئت پر ہے اگر وہ توبہ نہ کرے تو اللہ کی مرضی ہے کہ اسے عذاب کرے اور چاہے تو معاف کر دے۔ توبہ کرنے والے کے بارے میں کسی قسم کا اختلاف نہیں ہے توبہ سابقہ گناہوں کو معاف کر دیتی ہے۔ اللہ کی مشیئت پر وہ شخص ہوگا جو توبہ کیے بغیر مر گیا ہو جیسا کہ مسلم رحمہ اللہ کی روایت میں ہے عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ہم ایک مجلس میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے ہاتھ پر بیعت کرو کہ اللہ کے ساتھ کسی قسم کا شرک نہ کرو گے، زنا، چوری اور ناحق قتل نہ کرو گے جس نے یہ بیعت نبھائی اس کا اجر اللہ پر ہے۔ جس نے خلاف ورزی کی اور اس کو سزا مل گئی تو وہ اس کیلئے کفارہ ہوگی۔ جس نے کوئی نافرمانی کی اور اللہ نے اس کا پردہ رکھ لیا تو اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے چاہے تو معاف کر دے چاہے تو عذاب کرے (کتاب الحدود)

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے احادیثِ متواترہ سے ثابت ہے کہ جہنم میں جانے کے بعد کچھ لوگ نکالے جائیں گے اور کچھ جہنم میں جانے والوں کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سفارش کریں گے۔ یہ حدیثیں دو فرقوں وعیدیہ اور مرجئہ کے خلاف حجت ہیں۔ وعیدیہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی موحد جہنم میں چلا گیا تو دوبارہ نہیں نکل سکے گا۔ مرجئہ کہتے ہیں کہ ہمیں نہیں معلوم کہ کوئی اہل توحید جہنم میں جائے گا یا نہیں؟!۔ (فتاوی ابن تیمیہؒ: ۷/۴۷۶)

ابن تیمیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں:

اللہ کا فرمان ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ (النساء: ۴۸)

''اللہ شرک کو معاف نہیں کرتے اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہو جس کیلئے چاہے معاف کر دیتا ہے۔''

اللہ نے شرک کے علاوہ بقیہ گناہوں کی معافی کو اپنی مشیئت کے ساتھ معلق کر دیا ہے۔ اس کو توبہ کرنے والوں پر محمول نہیں کرنا چاہیے اس لیے کہ توبہ کرنے والے کے حق میں تو شرک اور دیگر گناہ یکساں ہیں۔ (فتاوی ابن تیمیہؒ: ۷/۴۸۵)

اسی طرح بے شک اللہ اپنے وعدے پورے کرے گا لیکن کسی خطا کار کو معاف کر دینا جبکہ اس نے توبہ نہ کی ہو یہ بھی تو کرم واحسان ہے جبکہ اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ احسان کرنے والا ہے وہ برائیاں کرنے والوں کو معاف کرتا ہے اگرچہ بندے کی طرف سے معافی کیلئے کچھ بھی پیش قدمی نہ کی گئی ہو۔ اللہ صرف اپنے فضل واحسان کی وجہ سے معاف کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ فسق وفجور کے ساتھ اللہ کی رحمت کی امید رکھی جائے اور گناہگار اپنے گناہوں میں مگن رہیں۔ اللہ کی پکڑ سے کوئی خود کو محفوظ نہ سمجھے۔ البتہ یہ کہنا کہ جب تک کوئی توبہ نہ کرے اللہ اسے معاف نہیں کرتا اللہ کے بارے میں جھوٹ بولنے کے مترادف ہے۔ جبکہ عبادہ رضی اللہ عنہ کی مذکورۃ الصدر حدیث اس معانی پر دلالت کیلئے کافی ہے۔ جیسا کہ گناہوں کی معافی کیلئے دیگر اسباب بھی ہیں جو توبہ کے بغیر بھی گناہوں کی مغفرت کا سبب بن جاتے

---

❶ اس کی وجہ یہ ہے کہ کبھی کبھی دل میں ایمان اور نفاق دونوں جمع ہو جاتے ہیں جیسا کہ حذیفہ رضی اللہ عنہ، ابن المبارک رحمہ اللہ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ سے روایتیں موجود ہیں کہ نفاق سے دل میں ایک کالا دھبہ پڑ جاتا ہے جب نفاق بڑھتا ہے تو یہ سیاہی بھی بڑھتی جاتی ہے یہاں تک پورے دل کو گھیر لیتی ہے۔ ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کتاب وسنت اس بات پر دلالت کرتے ہیں اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان کی کئی شاخیں ذکر کی ہیں اور نفاق کی بھی شاخیں بیان کی ہیں اور فرمایا ہے: ''جس میں نفاق کا ایک حصہ ہوگا وہ اتنا ہی منافق شمار ہوگا جب تک کہ وہ اس سے پلٹ نہ آئے۔'' مگر اس نفاق کے شعبہ کے ساتھ ایمان کی بہت سی شاخیں (ایک فرد مسلم کے اندر) ہوتی ہیں۔ (فتاوی ابن تیمیہؒ: ۷/۳۰۵)

ہیں مثلاً استغفار، سابقہ نیکیاں، کسی گناہگار کیلئے مؤمن کی دعا، مصائب و پریشانیوں کا آنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سفارش وغیرہ۔(فتاوی ابن تیمیة رحمہ اللہ:۷/۴۸۷)

﴿پانچواں اصول﴾ امر بالمعروف ونہی عن المنکر

معتزلہ نے امامت (حکمرانی) کیلئے قریشی ہونے کی شرط کا انکار کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ائمہ کے قریشی ہونے سے متعلق حدیث خبر واحد ہے اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ان میں سے بعض نے تو غلو سے کام لیتے ہوئے کہا ہے کہ اگر عجمی اور قریشی برابر ہوں تو عجمی کو ترجیح دی جائے گی حکمرانی کیلئے۔ (ضحی الاسلام ۔ احمد امین:۳/۷۳)

معتزلہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر طاقت ہو تو ظالم حکمران کے خلاف مسلح بغاوت واجب ہے۔ظالم حکمران سے مراد وہ حکمران بھی ہے جو معتزلہ کے عقائد کا پیرو نہ ہو یعنی معتزلہ کے عقائد کو نہ اپنانا بھی ایسا ظلم ہے کہ اس کیلئے حکمران کے خلاف مسلح بغاوت واجب ہے تاکہ وہ ان عقائد کو اپنانے پر مجبور ہو جائے۔(مقالات اشعری:۴۶۶)

جہاں تک خلفائے راشدین کا تعلق ہے تو بصری معتزلہ میں سے جیسے کہ بشر بن معتمر اور ابوجعفر اسکافی، ابوالحسین الخیاط علی رضی اللہ عنہ کو ابوبکر رضی اللہ عنہ پر ترجیح دینے کے قائل ہیں۔جبکہ واصل بن عطاء اور ابوالہذیل العلاف نے اس مسئلے میں توقف کیا ہے البتہ علی رضی اللہ عنہ کو عثمان رضی اللہ عنہ پر فضیلت دینے کے قائل ہیں۔اس مسئلہ میں بھی حق وہی ہے جسے اہل سنت نے اختیار کیا ہے کہ حکمرانی قریش کا حق ہے اس لیے کہ اس بارے میں صحیح حدیث آچکی ہے۔(مسلم، کتاب الامارہ، وغیرہ میں) اور بنوسقیف والی رات انصار کو جب یہ حدیث بتائی گئی تو انہوں نے اسے تسلیم کرلیا اور خلافت مہاجرین کے حوالے کردی۔امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی جو بات ہے۔

تو اللہ کا فرمان ہے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران:۱۰۴)

تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہیے جو خیر کی طرف بلائے اور جو اچھائی کا حکم کرے اور برائی سے روکے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران:۱۱۰)

''تم بہترامت ہو جسے لوگوں کے فائدے کیلئے نکالا گیا ہے کہ اچھائی کا حکم کرے برائی سے روکے۔''

یہ وہ عظیم اصل (بنیاد) ہے جو اس امت کی سب سے اہم صفت قرار دی گئی ہے لہٰذا اہل سنت معتزلہ وغیرہ سے زیادہ اس کو اپنانے کے دعوے دار ہیں۔فرق صرف اس کے مراد و مقصود میں ہے۔

اہل سنت کے نزدیک امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے اہم شروط یہ ہیں:

❶ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرنے والا امر و نہی کے مقام سے واقف ہو۔جس چیز کا حکم دے رہا ہے یا جس سے منع کر رہا ہے ان سے بھی اچھی طرح واقف ہو کہیں برائی کا حکم نہ کردے اور معروف سے روک دے۔

❷ اس کا امر یا نہی کسی بہت بڑی خرابی کا سبب نہ بن رہا ہو(یعنی جس برائی سے روک رہا ہے اس برائی سے بڑی خرابی اس کی نہی سے پیدا ہو رہی ہو تو نہی نہ کرے)اسی طرح امر کرنے سے پہلے مصلحت اور فائدے کو سامنے رکھے کہ کہیں اس کے امر سے فائدہ کم اور نقصان زیادہ نہ ہو جائے۔کہ چھوٹی برائی کو ختم کرنے کی کوشش بڑی برائی کے وجود کا سبب بن جائے۔(قواعد الاحکام فی مصالح الأنام لعز بن عبدالسلام:۶۲)

مثلاً ایک باغی شخص ہو وہ شطرنج کھیل رہا ہو ہم اس کو شطرنج سے روک دیں تو وہ اس سے رک جائے مگر ملک میں فساد پھیلانا شروع کردے لہٰذا ایسے آدمی کو اسی حال میں چھوڑنا بہتر ہے اس لیے کہ اس کا شطرنج کھیلنا صرف اس تک محدود برائی ہے جبکہ فساد فی الارض عام ہے جس سے دوسرے لوگوں کو تکلیف پہنچے گی۔اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے اہل سنت نے ان حکمرانوں کے بارے میں خروج نہ کرنے کی رائے اپنائی ہے جو اسلام کے احکامات نافذ کرتے ہیں مگر ان میں ظلم پایا جاتا ہے۔یا ان میں ایسا فسق و گناہ ہے جو ان کی ذات تک محدود ہو۔وہ اس کو ملک میں نہ پھیلاتے ہوں نہ اس کا حکم کرتے ہوں۔ایسے حکمرانوں کے بارے میں اہل سنت کہتے ہیں کہ ان کے خلاف مسلح بغاوت جائز نہیں۔اس لیے کہ ان کے ذاتی گناہ کی بنسبت لوگوں کا خون بہانا زیادہ بڑا گناہ ہے جبکہ خون بہانے کے باوجود بھی مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہو سکتے جیسا کہ تاریخ کے مطالعہ سے بھی ثابت ہو چکا ہے کہ کئی مرتبہ اچھے اور نیک مقصد کی خاطر دیندار لوگوں نے حکمرانوں سے بغاوت کی ہے مگر نیک لوگ

اور نیک مقصد ہونے کے باوجود سوائے بڑے بڑے نقصانات کے فائدہ کچھ حاصل نہیں ہوا ہے۔ اگر چہ امر بالمعروف کرنے والا بہت دیندار ہو پھر بھی صرف فسق کی وجہ سے کسی حکمران کے خلاف قتال یا بغاوت نہیں کی جا سکتی اس لیے کہ کسی حکمران کے ذاتی طور پر گناہ میں ملوث ہونے کی بنسبت قتال اور لوگوں کا خون بہانا زیادہ نقصان دہ ہے۔(فتاوی ابن تیمیةؒ:۲۲/۶۱)

ان کو برداشت کرنا، صبر سے کام لینا زیادہ صحیح ہے کیونکہ فتنہ وفساد پھیلنے سے حق کو پہچاننے اور اس کے حصول میں رکاوٹ آ جاتی ہے۔

(المصنّفات محمد بن عبدالوهابؒ:۵۱)

محمد بن حسن شیبانی کہتے ہیں: عوام کو چاہیے کہ حکمرانوں کی اطاعت کریں جب تک کہ وہ انہیں اللہ کی معصیت کا حکم نہ کریں اگر ایسا کریں تو پھر اطاعت نہیں ہے مگر تب بھی عوام کی ذمہ داری ہے کہ صبر کرتے رہیں حکمرانوں کے خلاف بغاوت نہ کریں۔(شرح السیر الکبیر،محمد بن الحسن:۱/۱۶۶)

المغنی میں ابن قدامہ نے بعض مسلم بادشاہوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جس نے عوام پر تلوار کی زور سے غلبہ حاصل کیا اور عوام نے اس کی حکمرانی تسلیم کر لی اور اسے امام بنا لیا ایسے کے خلاف بھی بغاوت اور قتال حرام ہے۔ اس لیے کہ بغاوت یا قتال میں مسلمانوں کے خون بہنے اور ان کے مال ضائع ہونے کے علاوہ کوئی فائدہ نہیں۔(المغنی لابن قدامة:۸/۱۰۷)

اہل سنت نے اپنی یہ رائے اس وجہ سے بھی قائم کی ہے کہ اس بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح احادیث موجود ہیں۔

انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سنو اور اطاعت کرو اگر چہ تم پر حبشی غلام امیر مقرر کر دیا جائے اور اس کا سر کشمش کی طرح ہو جب تک وہ تم میں کتاب اللہ (کے قوانین) کو قائم رکھے۔(بخاری:۷۱۴۲،کتاب الاحکام باب السمع والطاعة)

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عنقریب میرے بعد ایسی باتیں اور ایسے کام ہوں گے جو تمہیں پسند نہ ہوں گے لوگوں نے کہا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم آپ ہمیں کیا حکم کرتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم اپنی ذمہ داری پوری کرو اور اللہ سے اپنے حقوق مانگو۔(صحیح بخاری:۳۶۰۳، ومسلم)

یہ اور اس طرح کی دیگر احادیث کتاب وسنت کے مطابق مسلمانوں پر حکومت کرنے والے مسلم حکمران کی اطاعت اور ان کے خلاف عدم خروج پر واضح دلالت کرتی ہیں اگر چہ وہ کبھی کبھی ظلم کرے۔ معتزلہ اور زیدیہ اور خوارج اس رائے کے خلاف ہیں وہ کہتے ہیں کہ ظالم حکمرانوں کے خلاف بغاوت کرنی چاہیے جب بھی طاقت میسر ہو۔

ہم نے سابقہ سطور میں معتزلہ کے عقائد ذکر کیے جن کو انہوں نے دین کے طور پر اپنایا اور ان کی نشر واشاعت میں مصروف رہے بلکہ لوگوں کو ان کی طرف راغب کرنے کیلئے ہر قسم کے وسائل بروئے کار لاتے رہے یہاں تک کہ طاقت کے استعمال سے بھی دریغ نہیں کیا انہوں نے اللہ ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جسارت کی ہے کہ عقل پر لامحدود بھروسہ کیا ہے۔ اس بحث کو اختتام تک لے جانے سے قبل ہم چاہتے ہیں کہ ہم تین باتوں کی طرف کچھ توجہ کریں جن کا تذکرہ معتزلہ کے عقائد پر سابقہ بحث کے دوران آتا رہا ہے اور جن کا تعلق ان کے عقائد کی بنیاد اور استنباط کے اصولوں سے ہے۔

وہ تین باتیں مندرجہ ذیل ہیں:

① معتزلہ کا نظریۂ حدیث

② معتزلہ کی رائے تاویل کے بارے میں

③ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں معتزلہ کی رائے

❶ **حدیث کے بارے میں معتزلہ کی رائے:** شریعت کے مأخذ ومصادر میں حدیث قرآن کے بعد دوسرا مأخذ ہے یہ قرآن کی اولین تفسیر وتشریح ہے اس لیے ہر زمانے میں علماء نے اسے اپنائے رکھا۔ اس کے جمع وتدوین پر مکمل توجہ کی۔ جب کچھ بدعتی فرقوں نے سر اٹھایا اور اپنے مذاہب فاسدہ کو دلیل فراہم کرنے کیلئے احادیث وضع کرنی شروع کیں تو سلف صالحین نے سند کو رواج دیا اور اس کی تنقیح وتحقیق کا سلسلہ شروع کر دیا اس کیلئے علماء نے متعدد علوم وضع کیے تاکہ اس علم کی خدمت

ہو سکے مثلاً جرح و تعدیل، اسماء الرواۃ وغیرہ۔(مقدمة ابن الصلاح)

ابن سیرین رحمہ اللہ کہتے ہیں: پہلے محدثین اسناد کے بارے میں سوال نہیں کرتے تھے مگر جب فتنوں کا دور شروع ہوا تو محدثین نے سند طلب کرنی شروع کی ((سموا لنا رجالکم)) پھر راوی کو دیکھتے اگر اہلسنت میں سے ہوتا تو اس کی حدیث لے لیتے اگر اہل بدعت میں سے ہوتا تو ان کی حدیث نہیں لیتے۔(مقدمة صحيح مسلم)

اس کا فائدہ یہ ہوا کہ صحیح اور ضعیف احادیث میں فرق ہونے لگا۔ حدیث صحیح اور موضوع روایت پہچاننے میں مدد ملی۔ کیونکہ ضعیف اور موضوع احادیث رافضی اور بدعتی فرقے وضع کرتے تھے۔ اس طرح حدیث تمام شکوک وشبہات اور عیوب ونقائص سے پاک ہوگئی۔ مسلمان حدیث سے اپنے عقائد اور شرعی اعمال بلا تفریق لینے لگے۔ جس عقیدے پر کوئی حدیث دلالت کرنے والی مل جاتی اس عقیدے کو مسلمان دین کے طور پر اپنا لیتے، اس کی پیروی کرتے، جس عمل کی طرف حدیث رہنمائی کرتی مسلمان اس عمل کو بغیر کسی اختلاف وجدال اور شکوک وشبہات کے اپنا لیتے۔ بدعتی فرقوں کیلئے اس دیوار کو گرانا یا اس کا کوئی نہ کوئی حل ڈھونڈنا ضروری ہوگیا تھا اس لیے کہ یہ مضبوط دیوار عقیدہ اور عمل کی بنیادوں کی حفاظت بہت مضبوطی سے کر رہی تھی اور دین کی تفصیلات بھی اس میں بیان کی گئی تھیں اس دیوار کو گرانا اُن کیلئے اس لیے بھی ضروری تھا کہ یہ بدعتی فرقے دین میں من مانی اضافہ کر سکیں یا جو کچھ چاہیں دین میں سے کم کر سکیں۔ اس کیلئے ان فرقوں نے مختلف طریقے اپنائے مثلاً معتزلہ نے کہا خبر واحد علم یقینی کا فائدہ نہیں دیتی جبکہ عقل سے علم یقینی حاصل ہوتا ہے اور عقل ہی ذمہ داریوں کیلئے بنیاد ہے یعنی جس شخص کی عقل نہ ہو وہ شرعی احکام کا مکلّف نہیں ہے۔ لہٰذا عقل کے فیصلے کو خبر واحد پر مقدم کرنا ضروری ہے چاہے عقائد کا معاملہ ہو یا دیگر شرعی معاملات کا۔ بلکہ انہوں نے تو عقائد میں اخبار آحاد کو سرے سے ہی مسترد کر دیا یہ کہہ کر کہ عقائد صرف قطعی دلیل سے ثابت ہوتے ہیں ظنی سے نہیں اور خبر واحد ظنی ہوتی ہے لہٰذا اس سے عقائد ثابت نہیں ہو سکتے۔ خبر واحد کو ردّ کرنے میں یہ بھی نہیں دیکھتے کہ حدیث صحیح ہے یا ضعیف، صرف اتنا کافی ہے کہ وہ ان کے خیال میں عقل کے خلاف ہو۔ یا اس کے راویوں پر جرح کی جسارت کرتے ہیں چاہے کتنی گھٹیا جرح کیوں نہ ہو۔ انہوں نے کہا کہ صرف خبر متواتر ہی علم یقینی کا فائدہ دیتی ہے۔ اگرچہ عقلی فیصلے کو متواتر پر بھی انہوں نے مقدم رکھا ہے جب دونوں میں تعارض آئے۔ (حدیث متواتر اس کو کہتے ہیں کہ جس کو روایت کرنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ ہو کہ ان کا جھوٹ یا بھول پر قصداً یا غلطی سے متفق ہونا ممکن نہ ہو)۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے بہت سے ایسے عقائد کو ردّ کر دیا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے ثابت تھے مثلاً عذابِ قبر، حوضِ کوثر پر ایمان، پل صراط، میزان، شفاعت، اللہ کا دیدار (آخرت کے دن) وغیرہ۔ (مقالات الأشعري: ٢،٤٣٠/٤٧٢)

اسی طرح انہوں نے بہت سے شرعی احکام کو ردّ کر دیا جو صحیح احادیث سے ثابت شدہ تھے، بزعم خویش یا تو عقل سے معارض ہونے کی بنیاد پر یا کتاب اللہ سے متصادم ہونے کی وجہ سے یا کسی دوسری احادیث کے معارض کی وجہ سے۔

☆ جو حدیث عقل سے معارض ہونے کی بنا پر انہوں نے مسترد کیں، ان میں سے ایک یہ ہے: جب تم میں سے کوئی شخص نیند سے اٹھے تو وہ اپنا ہاتھ پانی میں نہ ڈالے جب تک تین مرتبہ دھو نہ لے۔ اس لیے کہ اسے نہیں معلوم کہ اس کے ہاتھ نے رات کہاں گذاری ہے؟(رواه مسلم، كتاب الطهارة)

یہ کہتے ہیں ہر شخص جانتا ہے کہ اس کے ہاتھ نے کہاں رات گذاری ہے؟ اور اگر نیند کی حالت میں اس کا ہاتھ ستر پر لگا ہو تو سویا ہوا شخص مرفوع القلم ہوتا ہے اس کے ان افعال پر جو وہ نیند میں کرتا ہے مؤاخذہ نہیں ہوتا اور اگر جاگے ہوئے شخص کا ہاتھ اس کے ستر پر لگ جائے تو نا پاک نہیں ہوتا تو سوئے ہوئے کیلئے اتنی سختی کیوں ہے؟ جبکہ وہ تو لاعلم ہے۔(تاويل مختلف الحديث ۔ ابن قتيبة/٨٨)

☆ اور جن احادیث کو انہوں نے اپنے خیال میں کتاب اللہ سے تعارض کی وجہ سے ردّ کیا ہے ان میں سے ایک یہ ہے:

((لا وصية لوارث)) (رواه الترمذي وقال حسن صحيح)

''وارث کیلئے وصیت نہیں ہے۔''

جبکہ ان کے خیال میں یہ قرآن کی اس آیت کے معارض ہے جس میں اللہ فرماتا ہے:

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ (البقرة: ١٨٠)

''جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت قریب ہو اس پر والدین اور رشتہ داروں کیلئے وصیت فرض کر دی گئی ہے۔''(تاويل مختلف الحديث ۔ ابن قتيبة/١٣٠)

والدین ہر حال میں وارث ہوتے ہیں۔

اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا ہے کہ پھوپھی بھتیجی اور خالہ بھانجی کو ایک نکاح میں رکھا جائے یہ قرآن کی اس آیت کے معارض ہے جس میں اللہ نے فرمایا ہے۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ............ (البقرة:۲۳)

اس میں پھوپھی بھتیجی اور خالہ بھانجی کا ذکر نہیں ہے۔

ابوبکر بن محمد کہتے ہیں: عمرو بن عبید نے کہا کہ بادشاہ کے علاوہ اور کوئی چور کو معاف نہیں دے سکتا تو میں نے اس کو صفوان بن امیہ رضی اللہ عنہ کی حدیث بیان کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چور کو لانے والے کو کہا تھا کہ تو نے (ہمارے پاس لانے سے) پہلے کیوں (معاف) نہ کیا عمرو بن عبید نے کہا تم اللہ کی قسم کھا کر کہہ سکتے ہو کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا ہے؟ میں نے کہا تم اللہ کی قسم کھا کر کہہ سکتے ہو کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کہا؟۔

(الاعتصام شاطبی ۱/۲۳۲،تاریخ بغداد للخطیب:۱۸۷۱۲)

یہی طریقہ ان تمام بدعتی فرقوں کا تھا جن کی بدعات کی راہ میں احادیث رکاوٹ بن رہی تھیں۔ امام شاطبی رحمہ اللہ ان بدعتیوں کے طریقے کے بارے میں فرماتے ہیں: یہ ان احادیث کو رد کر دیتے ہیں جو ان کے مذہب اور اغراض ومقاصد کے خلاف ہوتی ہیں جبکہ رد کرنے کیلئے بہانہ یہ کرتے ہیں کہ یہ عقل کے خلاف ہے جیسے کہ عذاب قبر، میزان، پل صراط، آخرت میں اللہ کا دیدار والی احادیث اور مکھی کے قتل اور اس کے ایک پر میں بیماری دوسرے میں شفاء اور مکھی کا بیماری والے پر کو مشروب میں مُقدّم رکھنے والی حدیث کو بھی رد کرتے ہیں اسی طرح اس حدیث کو بھی کرتے ہیں جس میں ہے کہ ایک شخص کے بھائی کا پیٹ خراب تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے شہد پلانے کا حکم دیا تھا۔انہوں نے اسی طرح کی دوسری صحیح ثابت شدہ احادیث کا بھی انکار کیا ہے۔کبھی تو یہ صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین رحمہم اللہ میں سے راویوں پر اعتراض کرتے ہیں اور کبھی ان راویوں پر نقد کرتے ہیں جن کی صحت، عدالت و دیانت پر ائمہ محدثین متفق ہیں یہ سب کام صرف اس لیے کرتے ہیں کہ اپنے مذہب کے مخالف دلائل کو رد کر سکیں۔

یہ لوگ محدثین کے فتاوی کو بھی رد کر دیتے ہیں اور ان میں نقائص وعیوب نکالتے ہیں تا کہ عوام کو سنّت اور اہل السُّنَّة کی اتباع سے متنفر کر سکیں۔

مزید فرماتے ہیں: ایک جماعت نے ساری خبرِ احاد کو رد کر دیا ہے ان کی نفی کی ہے اور فہم قرآن سے متعلق ان کی عقلوں نے جو کچھ بہتر جانا اسی کو اپنا لیا ہے جب یہ کسی خبر واحد کو رد کرتے ہیں عقل کے خلاف ہونے کی وجہ سے، تو ان کی باتوں کا مدار یہی ہوتا ہے کہ تحسین و تقبیح خالص عقلی معاملہ ہے۔(الاعتصام ۔ شاطبی ۱/۲۳۱)

اہل سنت کو اللہ نے یہ توفیق دی کہ انہوں نے ایسے کام وامور میں حق مذہب اختیار کیا۔ جہاں تک اخبارِ احاد کی حجیت کا تعلق ہے تو سلف کے ائمہ کا اس بات پر اجماع ہے کہ خبر واحد پر عمل واجب ہے چاہے عقائد ونظریات سے متعلق ہو یا شرائع سے۔پس اس طرح کی جو حدیث عقیدے پر دلالت کرتی ہے اسے سلف نے دین کے طور پر اپنایا اور جو شرائع پر دلالت کرتی ہے اسے واجبِ اطاعت جانا اور اس پر عمل کیا۔خبر واحد اگر صحیح سند سے مروی ہو تو اطمینان قلب کا فائدہ دیتی ہے لہٰذا اس کے تقاضوں پر عمل کرنا واجب ہے۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اس پر دلالت کرتے ہیں جیسا کہ کتب احادیث میں آتا ہے کہ اہل قباء کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ایک شخص نے آ کر خبر دی کہ قبلہ تبدیل ہو گیا ہے تو وہ لوگ بھی بیت اللہ کی طرف پھر گئے۔جب اس بات کی اطلاع نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ملی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر اعتراض نہیں کیا۔اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عُمّال کو ایک ایک کر کے (واحدً ابعد واحدٍ) مختلف علاقوں میں بھیجتے تھے۔اور (اس طرح) لوگوں کو (فردِ واحد کے ذریعے) اسلام کی دعوت پہنچایا کرتے تھے۔(ارشاد الفحول،۴۹)

اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی خبر واحد پر عمل اور اس سے اخذ واستنباط کا ثبوت ملتا ہے۔اس کی مثال ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ہے انہیں مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ اور محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ دادی کا میراث میں چھٹا حصہ ہے۔نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی کیا تھا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی دادی کیلئے چھٹا حصہ مقرر کیا۔اسی طرح عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی بات پر یقین کر کے مجوسی سے جزیہ لیا جو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان تھا کہ ان سے اہل کتاب والا سلوک کرو۔اسی طرح حمل بن مالک رضی اللہ عنہ کی خبر پر عمل کیا جو جنین سے متعلق تھی کہ ان کی دو بیویاں یعنی سوکنیں تھیں وہ آپس میں لڑ پڑیں تو ایک امید سے تھی دوسری نے بیلن کی لکڑی سے مارا اور اُس کا حمل ساقط ہو گیا تب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک غلام آزاد کرنے کا حکم دیا تھا۔عمر رضی اللہ عنہ نے کہا اگر یہ خبر ہم سن نہ لیتے تو کچھ اور فیصلہ کرتے۔اسی طرح عثمان وعلی رضی اللہ عنہما نے فریعہ بنت مالک کی خبر پر عمل کیا تھا کہ جس عورت کا شوہر فوت ہو جائے تو وہ شوہر کے گھر میں عدت گذارے گی۔اس صحابیہ رضی اللہ عنہا نے بتایا کہ میں شوہر کے انتقال کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور عدت ختم کرنے کی اجازت طلب کی تو آپ صلی اللہ

علیہ وسلم نے فرمایا ٹھہری رہو جب تک عدت پوری نہ ہو جائے۔اس طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دیگر بہت سے واقعات ہیں مثلاً عائشہ رضی اللہ عنہا، ابی بن کعب ، زید بن ثابت اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کے واقعات بلکہ یہی ایک دلیل اس بات کیلئے کافی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا خبر واحد قبول کرنے پر اجماع تھا کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سقیف والے دن کہا تھا کہ ((الائمة من قريش)) '' حکمران قریشی ہوں گے۔'' جس کو سب صحابہ نے تسلیم کیا پس یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف سے اجماع ہوا خبر واحد قبول کرنے پر۔(الآمدی، الاحکام، ۲/ ۹۰)

پھر خبر واحد قبول کرتے وقت یہ دیکھنا بھی ضروری نہیں کہ یہ عقائد سے متعلق ہے یا احکام سے اس لیے کہ اطمینان قلب دونوں معاملات میں حاصل ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ سلف کا قیامت میں اللہ کے دیدار، پل صراط، میزان، حوض، شفاعت اور عذاب قبر کے اعتقادات پر اجماع ہو چکا ہے۔

(مقالات اشعری، ۴۷۲، فتاوی ابن تیمیة رحمہ اللہ: ۳/ ۱۴۶)

خبر متواتر کے بارے میں اہلسنت کا عقیدہ ہے کہ یہ علم کا فائدہ دیتی ہے یعنی قطعی قلبی یقین جس میں کہیں سے کسی قسم کا شک نہ آ سکتا ہو۔ جب کہ اہل سنت محدثین اور فقہاء رحمہم اللہ میں سے ایک گروہ کی رائے ہے کہ خبر واحد عمل کا فائدہ دیتی ہے (یعنی اس پر عمل کیا جائے گا) مگر علم کا فائدہ نہیں دیتی، ایسا علم جو خبرِ متواتر کی مانند یقین قلب کا فائدہ دے کہ اس میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہ ہو۔ اس گروہ میں امام ابوحنیفہ، شافعی اور محدثین وفقہاء کی ایک تعداد شامل ہے۔ ❶

خبر متواتر سے جو قلبی یقین اور کذب کا عدم امکان ثابت ہوتا ہے اس میں اور خبر واحد سے حاصل ہونے والے قریب الیقین اطمینان قلب میں فرق ہے مگر یہ فرق ایسا نہیں ہے کہ خبر واحد کے عملی اور اعتقادی طور پر واجب العمل ہونے پر جو اجماع ہو چکا ہے اس کیلئے نقصان دہ ہو جیسا کہ بعض محدثین وفقہاء کہتے ہیں کہ خبر واحد علم کا فائدہ دیتی ہے۔ ان محدثین وفقہاء میں احمد بن حنبل، ابن تیمیہ، داؤد ظاہری، حسین بن علی الکرابیسی، مالک رحمہم اللہ وغیرہ شامل ہیں۔ (ارشاد الفحول - شوکانی، ۴۸)

معتزلہ نے احادیث کو ردّ کرنے کیلئے ایک جواز یہ بھی تراشا ہے کہ یہ احادیث کتاب اللہ، عقل یا دیگر احادیث سے متعارض ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تعارض ان کی ناقص عقلوں کی وجہ سے ہے ورنہ حقیقت میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

جو احادیث انہوں نے ردّ کی ہیں ان کی تفصیل وتطبیق حسب ذیل ہے:

① نیند سے اٹھ کر ہاتھ دھونے والی حدیث میں لفظ ہے کہ ((اين باتت يدهٔ)) اس کے ہاتھ نے کہاں رات گذاری؟۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ رات گذارنے کا پتہ نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ شاید اس نے اپنا ہاتھ آگے یا پیچھے ستر کو لگایا ہو اور اس پر پیشاب یا منی کا کوئی قطرہ لگ گیا ہو خاص کر اگر سونے سے پہلے اس نے جماع کیا ہو۔ اگر اس طرح کا ہاتھ پانی میں ڈالدیا جائے تو پانی ناپاک ہو جائے گا۔ سوئے ہوئے آدمی کا ذکر خصوصیت سے اس لیے کیا گیا ہے کہ عام طور پر نیند میں ہی ہاتھ ایسے مقامات پر لگتا ہے جبکہ اسے معلوم نہیں ہوتا۔ جبکہ جاگا ہوا شخص اگر ان مقامات میں سے کسی کو چھوئے گا تو اسے معلوم ہوگا کہ کوئی چیز لگی ہے یا نہیں لہٰذا وہ کھانا کھانے کی یا مُصافحہ کرنے کی صورت میں یا پانی کے برتن میں دھوئے بغیر ہاتھ نہیں ڈالے گا اس لیے کہ اس کو منع نہیں کیا گیا۔

(تاویل مختلف الحدیث۔ابن قتیبہ رحمہ اللہ، ۸۹)

② ((لا وصية لوارث)) اہل سنت کہتے ہیں کہ آیت: كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَر ...... منسوخ ہے مگر اسے سورۃ نساء میں موجود مندرجہ ذیل آیت میراث نے منسوخ کیا ہے:

يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِيٓ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَاتَرَكَ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ (النساء: ۱۱)

---

❶ کچھ علماء کی رائے ہے کہ علم سے مراد ہے امور اعتقادی سے تعلق رکھنے والے مسائل اور عمل سے مراد ہے جن کا تعلق فروعی مسائل سے ہو۔ اس پر بھی کچھ علماء نے ردّ کیا ہے، بہتر یہ ہے کہ ہم علم سے مراد پختہ یقین قلب لے لیں اور عمل سے مراد لیں کسی حدیث کو اعتقاداً وعملاً اپنانا۔ جو کہ یقین قلب کے بغیر نہیں ہو سکتا مگر رواۃ کی تعداد جتنی زیادہ ہوتی جاتی ہے یا مرتبہ میں اضافہ ہوتا ہے تو اطمینان بڑھتا جاتا ہے۔ کچھ علماء نے عمل سے مراد ظن لیا ہے جس کی اتباع سے اللہ نے منع کیا ہے۔ ﴿اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا﴾ ظن حق کو کوئی فائدہ نہیں دے سکتا۔ (یونس: ۳۶) مگر یہ بات غلط ہے بلکہ حدیث کیلئے لفظ ظن یقین کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے ''الرسالہ'' میں کیا ہے۔ ظن کیلئے علم کا لفظ استعمال ہوتا ہے ﴿فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ﴾ اگر تمہیں ظن غالب ہو کہ وہ مومن عورتیں ہیں۔(الممتحنة: ۱۰) تو یہاں ظن پر لفظ علم کا اطلاق ہوا ہے اور اسی پر عمل کو مترتّب کیا گیا۔ اور ظن جب علم کے معنی میں ہو تو شریعت میں یہ قطعی طور پر قابل اعتماد ہوتا ہے۔

(اعتصام، شاطبی ۱/ ۲۳۵ - ارشاد الفحول، شوکانی، ۲۷۶)

اللہ تمہیں تاکید کرتا ہے تمہاری اولاد کے بارے میں ۔ مرد کیلئے دو عورتوں کے برابر حصہ ہے ۔ اگر بیٹیاں دو سے زیادہ ہوں تو ان کیلئے دو ثلث ہیں ترکے میں سے ۔ اگر ایک ہو تو نصف ہے ۔ ماں باپ میں سے ہر ایک کیلئے چھٹا حصہ ہے اگر میت کی اولاد ہو۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حسن بصری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ والدین کیلئے وصیت سورۃ نساء کی آیت کی وجہ سے منسوخ ہوگئی ہے مگر جو اقرباء وارث نہیں ہیں ان کیلئے برقرار ہے ۔ یہی مذہب شافعی رحمہ اللہ، اکثر مالکیہ اور بہت سے علماء کا ہے ۔ ابن عمر، ابن عباس اور ابن زید رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ آیت پوری منسوخ ہے اور وصیت صرف مندوب ہے ۔ (تفسیر القرطبی: ۲/۲۶۳)

امام مالک رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے ۔

③ خالہ، بھانجی اور پھوپھی بھتیجی کو ایک نکاح میں رکھنا ؟ اللہ کا فرمان ہے :

وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (الحشر: ۷)

رسول جو کچھ تمہیں دے وہ لے لو اور جس سے منع کرے اس سے رک جاؤ۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (النساء: ۸۰)

جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی ۔

حدیث میں آتا ہے : ((الا انی قد اوتیت الکتاب ومثلہ معہ)) مجھے کتاب دی گئی ہے اور اس جیسی ایک اور چیز اس کے ساتھ یعنی احکام شریعت ۔ لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ حلال یا حرام قرار دیا ہے ان کو ماننا لازم ہے ۔ یہ اللہ کا حکم ہے ۔ (تفسیر القرطبی: ۵/۱۲۴)

امام قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں : اللہ نے جو کچھ اپنے رسول کے زبانی حرام کر دیا ہے اور آیت میں اس کا ذکر نہیں ہے وہ بھی حرام ہے ۔ اس کی حکمت واضح ہے اس لیے کہ شریعت میں قطع رحمی کی ممانعت ہے جبکہ سوکنوں میں قطع رحمی سب کو معلوم ہے لہٰذا خالہ بھانجی اور پھوپھی بھتیجی کو سوکنیں نہیں بنانا چاہیے ۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا ہے کہ کسی عورت منکوحہ کی موجودگی میں اس کے شوہر کی طرف سے اس عورت کی خالہ یا پھوپھی پر شادی کی جائے اور فرمایا کہ اگر اس طرح کرو گے تو قطع رحمی کرو گے ۔ اسی طرح کی روایت حسین بن طلحہ سے مراسیل ابی داؤد میں بھی ہے ۔ (تفسیر القرطبی: ۵/۱۲۶)

جب بظاہر دلائل میں باہم تعارض ہو تو اہل سُنّت کا منہج یہ ہے کہ دلائل کی تمام اطراف وطرق میں جمع وتطبیق کی جائے اور یہ تطبیق بھی معتبر طرق سے ہو ۔ اصول کی کتب میں مذکور ہے کہ دو صحیح (مگر باہم متعارض) دلیلوں کو بیک وقت استعمال کرنے سے ایک دلیل دوسری کو ساقط کر دیتی ہے جیسا کہ امام شوکانی فرماتے ہیں : (دلائل متعارضہ میں) ترجیح کی شرط یہ ہے کہ مشہور ومعتبر طرق میں سے کسی بھی طریقے سے ان میں تطبیق نہ دی جاسکتی ہو تاہم اگر تطبیق ممکن ہو تو اسی کو اپنایا جائے گا ترجیح کو نہیں اور امام شوکانی ''المحصول'' میں لکھتے ہیں دونوں پر عمل کرنا اس سے بہتر ہے کہ دونوں میں سے کسی ایک کو دوسری پر ترجیح دی جائے تمام فقہاء کا مذہب یہی ہے ۔

(ارشاد الفحول ـ شوکانی ،۲۷۶ ـ والموافقات ،شاطبی ۴/۲۹۴)

❷ **معتزلہ اور تاویل:** جب معتزلہ نے اپنے عقائد کے ثبوت کیلئے عقلی منہج اختیار کیا تو پھر انہیں ایک ایسے طریقے کی بھی ضرورت محسوس ہوئی جس کے ذریعے سے وہ ان صریح وصحیح احادیث وآیات کو ردّ کرسکیں جو ان کے عقائد کے خلاف ہو تاکہ وہ اپنے خود ساختہ عقلی نظریات کی حفاظت کرسکیں ۔ احادیث کے ساتھ انہوں نے جو سلوک کیا ہے اس کا حال گذشتہ صفحات میں ملاحظہ کر چکے ہیں کہ صحیح احادیث کو مختلف حیلوں اور بہانوں سے ردّ کرتے رہے ہیں کہ یہ ظنی ہیں یا خبر آحاد ہیں مگر قرآن کے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے تھے اس لیے کہ نہ وہ ظنی ہیں نہ خبر آحاد ہیں ان کو ردّ کرنا صریح کفر ہے لہٰذا اس کیلئے انہوں نے اور ہی زیادہ بدترین طریقہ اختیار کر لیا یعنی تاویل کا دروازہ کھول لیا ۔ ان کے بعد آنے والے متکلمین بھی پھر انہی کے نقش قدم پر چلتے رہے وہ بھی پھر کلام اللہ کے کلمات کو اپنے اصلی مقامات سے ہٹاتے رہے ۔

معتزلہ کہتے ہیں کہ اللہ عرش پر مستوی نہیں ہے (حالانکہ قرآن میں اللہ نے خود فرمایا ہے کہ رحمٰن عرش پر مستوی ہے) بلکہ کہتے ہیں کہ ''استوی'' کا معنی ہے قبضہ وغلبہ ، استواء کی تاویل کر کے انہوں نے استیلاء بنا دیا اللہ نے اپنے لئے ہاتھ ثابت کیا انہوں نے اسے نعمت قرار دیدیا ، اللہ نے اپنے لئے آنکھ کا ذکر کیا تو انہوں نے اس سے علم مراد لے لیا ۔ (مقالات اسلامیین ـ اشعری ،۱۹۵ ـ ۲۱۷ ـ ۲۱۸)

قرآن کی آیت ہے کہ :

اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ يّٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ (الزمر:٥٧)

نفس کہیگا! ہائے افسوس اُس کوتاہی پر جو میں نے اللہ کے پہلو میں کی۔

انہوں نے جنبٌ کا معنیٰ ''امر اللہ'' کیا ہے۔اسی طرح انہوں نے اللہ کی صفات محبت، رضیٰ، غضب اور غصہ وغیرہ میں بھی تأ ویلات کی ہیں کہ رضٰی ومحبت کا معنی ہے ثواب کا ارادہ، غصہ اور غضب کا معنی ہے عذاب کا ارادہ۔

اب اس بارے میں ہم اہلسنت کا موقف پیش کرتے ہیں۔

تاویل کا معنی: ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: کہ تاویل کا لفظ تین معنوں کیلئے استعمال ہوتا ہے۔

① تأ ویل کا ایک معنی تفسیر ہے۔مفسرین قرآن کی اصطلاح میں یہ اکثر مستعمل ہے جیسا کہ ابن جریر طبری رحمہ اللہ تفسیر یوں بیان کرتے ہیں: اس آیت کی تأ ویل اِس طرح ہے یعنی کہ تفسیر۔ (فتاوی ابن تیمیہ رحمہ اللہ:٣/٥٥)

② تأ ویل کا لفظ حقیقت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔وہ حقیقت جس کی طرف کلام اشارہ کرتا ہے۔جس طرح کہ قرآن میں ہے:

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْجَآءَ تْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ (الاعراف:٥٣)

یہ لوگ صرف اس بات کا انتظار کررہے ہیں کہ وہ حقیقت ان کے سامنے آجائے (جس کا ذکر کلام میں ہورہا ہے) اور جب وہ حقیقت آجائے گی تو جنہوں نے جھٹلایا تھا وہ کہیں گے کہ ہمارے رب کے رسول ہمارے پاس حق لیکر آئے تھے۔

اس آیت میں تاویل سے مراد قیامت کی خبر ہے جو کہ حساب، جنت، جہنم، ثواب وعذاب وغیر سے متعلق ہے۔جیسا کہ سورہ یوسف میں اللہ تعالیٰ یوسف علیہ اسلام سے حکایۃً فرماتا ہے: ﴿يٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ﴾ ''اے ابا جان! یہ حقیقت ہے اس خواب کی جو پہلے (میں نے دیکھا تھا)'' (یوسف:١٠٠) تو جو کچھ سامنے حقیقت آئی اس کو خواب کی تعبیر بتایا۔

اسی طرح ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کی بات کا بھی یہی مقصد ہے وہ فرماتی ہیں:

((كان النبي صلى الله عليه وسلم يقول في ركوعه وسجوده سبحانك اللّٰهم وبحمدك اللّٰهم اغفرلي يتاؤل القرآن يعني قوله)) ﴿فسبح بحمد ربک واستغفره﴾ (النصر:٣)

یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم رکوع وسجدہ میں اللہ کی تسبیح اور اللہ سے استغفار کرتے تھے اللہ کے فرمان کی حقیقت پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اس دعا میں بیان کرتے تھے وہ فرمان ہے۔''کہ اپنے رب کی تعریف کے ساتھ اس کی تسبیح بیان کر اور استغفار کر۔''

سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ کا قول ہے ((السنة هي تأويل الأمر والنهي أي عمله والقيام به في الحقيقة)) ''سنت کسی امر شرعی اور نہی کی تاویل یعنی اُس پر عمل کرنے اور حقیقت میں اُس پر اہتمام کرنے کا نام ہے۔'' (فتاوی ابن تیمیہ رحمہ اللہ:٣/٥٦)

ابن الفارس رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ تأ ویل کسی امر کے انجام کو کہتے ہیں۔

③ تیسرا معنی تاویل کا وہ ہے جو متاخرین متکلمین نے استعمال کیا ہے اور اصولیین کے ہاں بھی مستعمل ہے۔اور وہ ہے کسی لفظ کو اس کے اصلی معنی سے پھیر کر دوسرے معنی کی طرف لیجانا جبکہ کوئی ایسی دلیل موجود ہو جو ظاہری معنی مراد لینے میں مانع ہو۔معتزلہ نے اس تیسرے معنی کو لیا ہے اور اسی سے اپنا کام چلایا ہے کہ اللہ کی صفات کے ظاہری معنی کے بجائے کچھ اور معنی مراد لیے ہیں۔اگرچہ معتزلہ کی کتب میں تاویل کا یہ معنی مذکور نہیں ہے مگر عمل ان کی کتابوں میں اس پر ہوا ہے کہ صفات کی آیات کے ظاہری معانی چھوڑ کر دوسرے معنی مراد لیے اور وجہ اس کی یہ بتائی کہ اللہ کی تنزیہ و پاکی کا تقاضا یہی ہے اس لیے کہ اگر ہم ان آیات صفات میں ظاہری معنی مراد لیں گے تو اللہ کی اپنی مخلوق کے ساتھ تشبیہ لازم آتی ہے۔جبکہ تاویل کے اس معنی سے سلف نے کوئی کام نہیں لیا ہے بلکہ انہوں نے تاویل لفظ کو صرف پہلے اور دوسرے معنی میں استعمال کیا ہے یعنی تفسیر اور انجام۔لہٰذا تاویل کا تیسرا معنی لے کر آیات صفات میں اسے استعمال کرنا ایسی بدعت ہے جو سلف کے ہاں نہیں تھی۔تاویل ایک اور اصطلاح میں احکام شرعیہ سے متعلق آیات میں بھی استعمال ہوتا ہے وہاں اس کا مطلب ہوتا ہے عام کو خاص کرنا جیسا کہ آیت میں ہے: ﴿وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ

اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ﴾(الطلاق:٤)حمل والی عورتوں کی عدت وضع حمل ہے۔اور آیت: ﴿وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ﴾''جولوگ فوت ہوجاتے ہیں اور بیوائیں چھوڑ جائیں تو ان کی عدت چار مہینے دس دن ہے۔''(البقرۃ:٢٣٤) بظاہر دونوں آیات میں تعارض ہے کہ پہلی آیت میں بیوہ کی عدت وضع حمل ہے اور دوسری میں چار ماہ دس دن۔اس کا حل یہ ہے کہ چار ماہ دس دن کی عدت غیر حاملہ کیلئے ہے اور حاملہ کی تخصیص کی گئی کہ وہ وضع حمل تک عدت گذارے گی۔اسی طرح مطلق حکم کو مقید کرنے کو بھی تاویل کہتے ہیں: ﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ﴾''تم پر مردار،خون،خنزیر کا گوشت اور جس پر غیر اللہ کے نام پکارا جائے حرام کردیا گیا۔''(المائدۃ:٣) دوسری آیت ہے: ﴿قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ﴾''کہہ دیجئے کہ مجھ پر جو وحی آتی ہے اس میں کھانے والے پر میں کچھ حرام نہیں پاتا سوائے بہتے خون،مردار،خنزیر کے گوشت اور جن پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو''(الانعام:١٤٥) پہلی آیت میں صرف خون کا ذکر ہے دوسری میں دم مسفوح ہے۔پہلی آیت مطلق تھی جبکہ دوسری مقید ذکر ہوئی۔اس کو کہتے ہیں ظاہر مطلق لفظ کو مقید کی طرف پھیر دینا۔(اصول الفقه،ابوزهرة:١٣٧)

اس قسم کی تاویل فقہی احکام میں کی جاتی ہے اور یہ صحیح تاویل ہے تاکہ ہم شریعت کے صحیح احکام تک پہنچ سکیں اور ہمیں شرعی احکام کی تمام شروط وقیود کا علم ہوسکے۔تاویل فاسد سے اجتناب کرنا چاہیے اس لیے کہ اس کا نتیجہ غلطی کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔جیسا کہ حدیث میں آتا ہے: جو عورت اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرے گی اس کا نکاح باطل ہوگا۔اس کا مطلب بعض فقہاء نے یہ لیا ہے کہ اس سے مراد چھوٹی بچی ہے یا لونڈی مراد ہے حالانکہ یہ تاویل غلط ہے یہ کلام کو اس کے ظاہری مفہوم سے بالکل ہی الٹ معنی کی طرف لیجانے والا ہے۔(احکام للا مدی:٣/٨١)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ تاویل کا جو یہ ایک اصطلاحی معنی ہے یہ درحقیقت کلام کے ظاہری مفہوم کی ہی ایک شکل اور قسم ہے۔شریعت کا عام قاعدہ یہ ہے کہ کلام کے ظاہری مفہوم پر عمل کیا جائے گا اسی کو مقدم رکھا جائے گا بلکہ یہ شریعت کا قانون اور کلی قاعدہ ہے یہی بنیاد ہے شرعی احکام ماننے کی جیسا کہ شاطبی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے: کلام کا اگر ظاہری معنی ومفہوم کسی طرح سے لیا جاسکتا ہو تو وہی لیا جائے گا کسی قطعی قرینہ کے بغیر ظاہری مفہوم سے پھیرنا نہیں چاہیے۔کسی لفظ کے فقط ظاہری معنی کو چھوڑ کر دوسرا معنی لینے کیلئے شرط یہ ہے کہ وہ دوسرا معنی لینا ممکن بھی ہو،اُس کا احتمال ہو اور تاویل شدہ لفظ اسی معنی کا حامل ہو ورنہ تاویل فاسد ہوگی۔فاسد تاویل کی مثال ہے: بیانیہ فرقے کے بیان بن سمعان کا قول۔

جس نے خود کو الٰہ قرار دیا تھا اس نے آیت سے خود کو مراد لیا تھا جس میں ہے ﴿بَيَانٌ لِّلنَّاسِ﴾ آیت کا معنی ہے کہ یہ کتاب لوگوں کیلئے وضاحت ہے۔جبکہ بیان بن سمعان نے کہا اس کا معنی ہے کہ بیان بن سمعان لوگوں کیلئے (الٰہ) ہے۔اسی طرح اللہ کا فرمان ہے ﴿وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا﴾ " اللہ نے ابراہیم (علیہ السلام) کو دوست بنایا۔''(النسآء:١٢٥) اس کی تاویل کی گئی ہے کہ خلیل کا معنی یہاں فقیر ہے ورنہ اصلی معنی مناسب نہیں۔یہ تاویل بھی فاسد ہے۔

(الفرق بين الفرق للبغدادی:٢٥٥)

یہی وجہ ہے کہ اہلسنت اور امت کے سلف صالحین نے صفات باری تعالیٰ کو بلا تمثیل مانا ہے اور اللہ کو پاک منزہ مانا ہے کہ اس کی صفات میں تعطیل نہیں ہے اس بارے میں آیات واحادیث کو (تاویل کے بجائے) ظاہری معانی پر محمول کیا ہے مگر خالق ومخلوق کی صفات میں مُشابہت کے بغیر اور کیفیت کے بغیر۔یہی حق مذہب ہے جس پر ائمہ اور تابعین کا اجماع ہے کہ ہم اللہ کی صفات کو ظاہری معنی کے مطابق مانتے ہیں مگر بغیر کیفیت اور مخلوق کی مشابہت کے ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾''اس جیسی کوئی چیز نہیں۔''(الشوری:١١) جبکہ مشبہ اور معطلہ کے ذہن تشبیہ نے خراب کردیئے ہیں اس لیے انہوں نے کوشش کی ہے کہ کسی بھی طرح ظاہری معانی سے ان آیات واحادیث کو پھیر دیا جائے تو وہ تاویل پر مجبور ہوگئے اپنے اعتقادات کی وجہ سے۔اہل سنت میں ابوحنیفہ،ابن حنبل،شافعی،اوزاعی،ثوری،حسن اور جمہور علماء رحمہم اللہ کی رائے ہم پہلے پیش کرچکے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (القصص:٨٨)

ہر چیز ختم ہونے والی ہے سوائے اللہ کے چہرے کے اسی کا حکم ہے اور اسی کی طرف تم سب لوٹائے جاؤ گے۔

يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ (الفتح:١٠)

اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے۔

وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا (ھود:۳۷)

کشتی بناؤ ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہماری وحی کے مطابق۔

صحیح مسلم میں حدیث ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ دن کو اپنا ہاتھ پھیلاتا ہے تاکہ رات میں گناہ کرنے والا توبہ کرلے اور رات کو ہاتھ پھیلاتا ہے تاکہ دن کو گناہ کرنے والا توبہ کرلے۔

صحیح مسلم میں ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہتے ہیں: ہمارے درمیان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوکر چار کلمات کہتے۔ اللہ سوتا نہیں ہے اور اس کیلئے لائق نہیں کہ وہ سوئے۔ انصاف کے ترازو کو پست وبلند کرتا رہتا ہے۔ اس کی طرف اٹھتا ہے رات کا عمل دن سے پہلے اور دن کا عمل رات سے پہلے اور اس کا پردہ آگ ہے اگر اسے ہٹادے تو اس کے چہرے کی چمک جلا ڈالے ہر اُس چیز کو جس کو اُس کی نظر گھیرلے۔

صحیح بخاری میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کا ہاتھ بھرا ہوا ہے دن رات کے صدقات اس میں کمی نہیں کرتے۔

بخاری میں انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (اللہ) جہنم میں (جہنمیوں) کو ڈالتا رہے گا اور (جہنم سے) پوچھتا جائے گا کہ مزید ضرورت ہے؟ یہاں تک اپنا پاؤں اس میں رکھ دے گا تو جہنم کہیگی: بس بس۔ (شرح اصول اعتقاداھل السنة للالکائی:۳/۴۱۲)

امام اشعری کہتے ہیں: اصحاب الحدیث کہتے ہیں ہم ان تمام مذکورہ آیات واحادیث کے بارے میں صرف وہی کہیں گے جو اللہ نے کہا اور جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہوکر ہم تک پہنچا ہے ہم کہتے ہیں کہ چہرہ ہے بلا کیف، ہاتھ ہیں، آنکھیں ہیں مگر بلا کیف۔

(مقالات الاسلامیین، ا شعری:۲۱۷)

حافظ لالکائی رحمہ اللہ نے محمد بن حسن شیبانی سے نقل کیا ہے کہ مشرق تا مغرب فقہاء نے اتفاق کیا ہے کہ قرآن اور صحیح احادیث میں اللہ کی جو صفات بیان ہوئی ہیں ان پر ایمان لانے پر بلا کیف، بلا وصف، بلا تشبیہ۔ (شرح اصول اعتقاد اھل السنة:۳/۴۳۲، الفتاوی لابن تیمیہؒ:۳/۲)

③ معتزلہ کا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں موقف: جب معتزلہ نے امت کے متفقہ موقف کو چھوڑ کر علیحدہ موقف اپنایا اور خود کو عقل پسند مشہور کیا، عقل کو فیصلہ کن قوت قرار دیدیا تو اس کا ایک غلط نتیجہ یہ بھی نکلا کہ انہوں نے صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین رحمہم اللہ کے بارے میں وہ نظریات بھی سامنے لائے جو صحابہ رضی اللہ عنہم کی توہین پر مبنی تھے معتزلہ کے اکابر نے اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم پر بھی طعن کیا، ان کے عیوب بیان کیے ہیں، انہیں جھوٹا قرار دیا ہے اور ان کی طرف اختلافات منسوب کیے ہیں۔

چند مثالیں پیش خدمت ہیں۔

① معتزلہ کے امام اور اُن کے سب سے قابل فخر، عقل کل وسمجھ دار کہلانے والے ابراہیم نظام!! نے کہا ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے قول وفعل میں تضاد تھا کہ ایک طرف کہتے تھے کہ اگر میں اپنی رائے سے جو اللہ کی مراد کے خلاف ہو کتاب اللہ کی تفسیر کروں تو کونسا آسمان مجھے سایہ فراہم کرے گا اور کونسی جاءِ زمین مجھے پناہ دیگی یا میرا کیا ٹھکانہ ہوگا یا میرے ساتھ روزِ آخرت کیا برتاؤ کیا جائیگا؟ اور دوسری طرف ان کا عمل یہ ہے کہ جب ان سے کلالہ کے بارے میں پوچھا گیا، تو کہا: کہ اس کی تفسیر میں اپنی رائے سے کروں گا اگر صحیح رہی تو یہ اللہ کی طرف سے اور اگر غلط ہوئی تو اس کی ذمہ داری مجھ پر ہوگی۔ کلالہ والد اور ولد سے کم ہے۔ یہ تضاد وتناقض ہے۔ اللہ کا خوف رکھنے والا کس طرح تفسیر بالرائے کی جراءت کرسکتا ہے؟ ابراہیم نظام جھوٹا ہے اس لیے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا پہلا قول اس موقع کا ہے جب متشابہ آیت کے بارے میں ان سے سوال ہوا تھا اور راسخین فی العلم کا متشابہ آیت میں یہی جواب ہوتا ہے کہ اس کی تاویل صرف اللہ جانتا ہے۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا دوسرا قول تو علماء کی ذمہ داری سے تعلق رکھتا ہے کہ ان پر لازم ہے کہ لوگوں کے سامنے دین کے احکام بیان کریں، ان کیلئے اجتہاد کریں تاکہ ان کا نظام افراتفری سے محفوظ رہے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اس قول کہ میں اپنی رائے سے بتاؤں گا کا مطلب یہ تھا کہ میرا علم اور میری فکر مجھے جس نتیجے پر پہنچائے گی وہی بتاؤں گا۔ پھر بھی صحیح بات اپنی طرف منسوب کرنے کے بجائے اللہ کی طرف منسوب کی اور خطاء اپنی طرف۔ یہ ادب اور کسر نفسی کا اظہار تھا اس لیے کہ وہ امت کے سب سے سچے آدمی تھے۔

② علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ پر بھی اس نے طعن کیا ہے کہ جب علی رضی اللہ عنہ سے اس گائے کے بارے میں پوچھا گیا جس نے گدھے کو قتل کیا تھا اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ پر بروع بن واشق کے معاملے میں طعن کیا ہے۔

③ معتزلہ کے ابراہیم نظام اور روافض نے سب سے زیادہ شدید حملے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ پر کئے ہیں کہتے ہیں کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو عائشہ، عمر، عثمان و علی رضی اللہ عنہم اجمعین نے جھوٹا قرار دیا تھا! یہ بات بھی جھوٹ ہے بلکہ یہ صرف نقطۂ نظر کا اختلاف تھا جس طرح کہ فقہاء میں ہوتا ہے اس کو بغض ونفرت پر محمول نہیں کیا جا سکتا نہ ہی اس طرح کے اختلاف سے کسی کی قدر ومنزلت میں کمی آتی ہے۔ اس ابرہیم نظام نے عمر رضی اللہ عنہ پر جھوٹ باندھا کہ انہوں نے جد کے بارے میں ایک سو قسم کے مختلف فیصلے کیے تھے۔ حالانکہ یہ جھوٹ ہے کہاں ہیں؟ وہ فیصلے کس نے یاد کئے؟ کس نے محفوظ رکھے؟۔

④ اس نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو بھی جھوٹا قرار دیا! انشقاق قمر والے واقعے کو روایت کرنے کی وجہ سے، ابراہیم نظام کہتا ہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اتنا بڑا واقعہ کسی اور نے نہیں دیکھا اور نہ ہی کوئی اس کی وجہ سے مسلمان ہوا؟ حالانکہ نظام دراصل کتاب اللہ کی تکذیب کر رہا ہے جس میں مذکور ہے ﴿اقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ﴾ ''قیامت قریب آ گئی چاند پھٹ گیا۔'' (القمر:۱) یہ کہتا ہے کہ کسی اور نے نہیں دیکھا تو پھر اس آیت کا کیا معنی ہوگا ﴿وَإِنْ يَرَوْا آيَةً يُعْرِضُوا وَيَقُولُوا سِحْرٌ مُسْتَمِرٌّ﴾ ''یہ جب بھی کوئی نشانی دیکھتے ہیں اس سے منہ موڑ لیتے ہیں اور کہتے ہیں یہ مسلسل چلا آنے والا جادو ہے۔'' (القمر:۲) آیت میں جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے تو نظام کیسے کہتا ہے کہ کسی اور نے نہیں دیکھا۔ یہ صرف عقل کا فیصلہ ہے جب وہ تنہا ہو شریعت کے بغیر ہو تو اسی طرح گمراہ ورسوا ہوتا ہے۔

⑤ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ پر بھی طعن کیا ہے اس حدیث کے سلسلے میں جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ بدبخت وہ ہوتا ہے جو ماں کے پیٹ میں بدبخت لکھ دیا جاتا ہے اور خوش بخت وہ ہوتا ہے جو دوسروں سے عبرت ونصیحت حاصل کرتا ہے۔

حالانکہ یہ صحیح حدیث ہے مسلم رحمہ اللہ نے اسے روایت کیا ہے، تقدیر پر ایمان لانا واجب ہے مگر ان کے مذہب نے انہیں اس کے انکار پر آمادہ کیا ہے اسی طرح انہوں نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو واقعہ جنّ کے بارے میں (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جنّات کے دیدار کے متعلّق اور انہیں وعظ کرنے کے متعلّق) بھی جھوٹا قرار دیا ہے!

⑥ یہ کہتے ہیں کہ عمر رضی اللہ عنہ نے حدیبیہ والے دن دین پر شک کا اظہار کیا تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی موت کے دن بھی شک کیا عمر رضی اللہ نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کو مارا تھا۔ اہل بیت کی میراث بند کر دی تھی نماز تراویح کی بدعت ایجاد کی عربی عورتوں سے غلاموں کا نکاح حرام قرار دیا تھا!!

(الصلة بين الاعتزال والتشيع من قديم)

⑦ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ پر الزام لگاتے ہیں کہ انہوں نے حکم بن عاص کو مدینہ کا والی مقرر کیا اور اپنے رشتہ داروں کو ترجیح دیتے تھے۔

(تاويل مختلف الحديث لابن قتيبة:۱۷، والفرق بين الفرق للبغدادي:۱۴۷)

❹ تابعین رحمہم اللہ پر طعن

① عمرو بن عبید، معتزلہ کے زاہد اور سرغنہ ہیں ان کے بارے میں شاطبی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ عمر بن نضر کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ عمرو بن عبید سے کوئی مسئلہ پوچھا گیا تو اس نے جواب دیا میں نے کہا: ہمارے اصحاب تو ایسا نہیں کہتے تھے، اس نے کہا: تمہارے اصحاب کون ہیں؟ میں نے کہا: ایوب، یونس، ابن عون اور تیمی رحمہم اللہ، اس نے کہا: یہ تو لوگوں کا میل کچیل تھے! مر گئے اب زندہ نہیں ہیں۔

② ابن علیّہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: مجھے یسع نے بتایا کہ واصل بن عطاء معتزلی نے ایک مرتبہ کچھ بات کی تو عمرو بن عبید معتزلی نے کہا کہ تم ہماری بات کیوں نہیں سنتے؟ حسن اور ابن سرین (رحمہما اللہ) کی جو باتیں تم سنتے ہو وہ تو فقط حیض کے پھینکے ہوئے کپڑے ہیں!! (اعتصام، شاطبی:۱/۲۳۲)

واصل بن عطاء اور عمرو بن عبید دونوں کا نظریہ وخیال تھا کہ جنگ جمل میں ایک گروہ فاسق تھا یا تو علی بن ابی طالب، عمار بن یاسر، حسن، حسین اور ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہم کا گروہ یا عائشہ، طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہم کا گروہ۔ ان صحابہ کی گواہی (یا روایتیں) انہوں نے قبول نہیں کی بلکہ ردّ کر دی ہیں۔ یہ کہتے تھے کہ ان کی گواہی قبول نہیں کی جا سکتی!! (الفرق بين الفرق للبغدادي:۱۲۰)

یہ تو معتزلہ کے خیالات تھے جبکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے فرامین کچھ اس طرح ہیں۔

لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ فَعَلِمَ مَا فِیْ قُلُوْبِھِمْ فَاَنْزَلَ السَّکِیْنَۃَ عَلَیْھِمْ (الفتح:۱۸)

اللہ مؤمنوں سے راضی ہو گیا جب وہ تجھ سے بیعت کر رہے تھے درخت کے نیچے اللہ نے جان لیا جو ایمان ان کے دلوں میں ہے چنانچہ اللہ نے اُن پر سکینہ (اطمینانِ قلبی) نازل کی۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ تَرٰھُمْ رُکَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانًا سِیْمَاھُمْ فِیْ وُجُوْھِھِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ذٰلِکَ مَثَلُھُمْ فِی التَّوْرٰۃِ وَمَثَلُھُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ کَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْاَہٗ فَاٰزَرَہٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰی عَلٰی سُوْقِہٖ یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِیَغِیْظَ بِھِمُ الْکُفَّارَ (الفتح:۲۹)

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں کفار پر سخت اور آپس میں رحم دل ہیں آپ ان کو دیکھیں گے رکوع میں اور سجدے میں اللہ کا فضل اور اس کی رضامندی تلاش کرتے ہیں اُن کی نشانی اُن کے چہروں میں سجدوں کے اثر کی بدولت عاجزی ہے یہ ان کی مثال ہے تورات میں اور انجیل میں جیسے کھیتی جس نے نکالا پودا پھر اسے مضبوط کیا پھر وہ سخت ہوا پھر اپنی نال پر کھڑا ہو گیا اچھا لگتا ہے کھیتی والوں کو تا کہ اِن (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب رضوان اللہ علیہم) کی وجہ سے اللہ کافروں کو غُصّہ دلائے۔

علماء نے تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی عدالت پر اتفاق کیا ہے، غزالی فرماتے ہیں: ''جس بات پر علماء سلف وخلف کا اتفاق ہے وہ یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عدالت معلوم ہے کیونکہ اللہ نے اپنی کتاب میں انہیں عادل قرار دیا ہے اور ان کی تعریف کی ہے یہی ہمارا عقیدہ ہے صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں جب تک کہ ان میں سے کسی کا فسق قطعی دلیل سے ثابت نہ ہو جائے اور اب تک ایسا ثابت نہیں ہوا لہٰذا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں سے کسی کی عدالت کی تحقیق کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' (المستصفی للغزالی:۱/۱۶۵)

ان صحابہ رضی اللہ عنہم میں باہم جو اختلاف ہوئے تو ان کے بارے میں اہل سنت کہتے ہیں کہ ہم ان اختلافات کی گہرائی میں نہیں جاتے بلکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ وہ سب مجتہد تھے ہر ایک اپنے اجتہاد سے آخرت کا اجر تلاش کرتے تھے اور اللہ اُن سب سے راضی ہیں اب کسی کا اجتہاد صحیح ہوا اور کسی سے غلطی ہو گئی۔

تیسری فصل

معتزلہ کی سیاسی وفکری تبدیلیاں

① **فکری تبدیلی:** انسانی افکار ہمیشہ متغیر ہوتے رہتے ہیں خصوصًا نئے افکار کی ہمیشہ سے یہ خاصیت رہی ہے کہ وہ ابتداء میں لفظی ومعنوی لحاظ سے بسیط وسادہ ہوتے ہیں پھر کچھ ہی عرصہ بعد ان میں شاخیں بننے لگتی ہیں، تغیر وتبدل آجاتا ہے پھر تناقض وتضاد آجاتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ابتدائی افکار یکسر تبدیل ہو جاتے ہیں ان کی جگہ نئے افکار لے لیتے ہیں۔ مگر یہ تبدیلی بہتری کے بجائے بد سے بدتر کی طرف جارہی ہوتی ہے۔ یہ افکار دن بدن سنت سے اور دور ہوتے جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوتا ہے کہ ان میں عقل پر اتنا اعتماد کیا جاتا ہے کہ عقل اس قابل ہوتی نہیں اس لیے کہتے ہیں کہ بدعتی کو توبہ کی توفیق نہیں ہوتی۔ (اعتصام، شاطبی:۱/۱۲۳) بدعتی بد سے بدتر حالت کی طرف جاتا رہتا ہے اس کے برعکس وہ شخص جو سنت کا صحیح راستہ اپنا لیتا ہے صحیح نصوص کو تھام لیتا ہے تو اس کے انحراف وگمراہی کا کوئی اندیشہ نہیں ہوتا اس لیے کہ دین تو نصوص صحیحہ کے ثابت ہونے اور نّص کے متعلق قواعد فقہ کے درمیان ہے جبکہ یہ دونوں چیزیں اہل سنت والجماعت کے نزدیک واضح ہیں اور ان کے منہج کے مطابق ہیں۔ افکار میں تبدیلی معتزلہ کی فکر اور ان کے مختلف اقوال میں واضح نظر آتی ہے یہ تبدیلی تین صدیوں کے دوران واقع ہوتی رہی ہے جن میں باقاعدہ اعتزال کا نظریہ ایک فرقے کی صورت اختیار کر گیا اس کا تذکرہ ہم آئندہ صفحات میں اختصار کے ساتھ کریں گے۔ ان شاء اللہ

❶ **اعتزال کے ابتدائی افکار؟:** جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کہ پہلے پہل اعتزال کی فکر مستقل فرقے کی صورت میں نمودار نہیں ہوئی تھی بلکہ پہلے جعد بن درہم اور اس کے بعد جہم بن صفوان نے صفات کی نفی کی تھی۔ جعد بن درہم وہب بن منبہ رحمہ اللہ کا شاگرد تھا وہب نے اپنے شاگرد کی نفیِ صفاتِ باری تعالیٰ کی بات مسترد کی تھی۔ ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں سب سے پہلے اسلام میں یہ بات جو سنی گئی کہ اللہ عرش پر حقیقتاً مستوی نہیں ہے وہ جعد بن درہم کی طرف سے سنی گئی اس کے بعد جہم بن صفوان

نے اِس عقیدے کو اپنایا جنہوں نے "استوٰی" کا معنیٰ "اِستولیٰ" کیا یہ نظریہ جعد کا تھا مگر مشہور جہم نے کیا اس لیے جہمیہ کے نام سے یہ عقیدہ آگے پھیلا۔(فتاوی ابن تیمیہ رحمہ اللہ:۵/۲۰)

کچھ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ جعد کے نظریات یہودی فلسفہ کے اصولوں سے ربط رکھتے ہیں۔اس نے اپنا یہ خیال ابان بن سمعان سے لیا تھا اور ابان نے طالوت سے اور طالوت نے اپنے ماموں لبید بن اعصم یہودی سے لیا تھا۔(عقائد السلف للنشار:۷)

یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ جہم نے یہ قول جعد سے لیا تھا جب اس کا مباحثہ فرقہ سمنیہ (ہندوستان میں کفار کا ایک فرقہ تھا جو آواگون کا قائل ہے) چل رہا تھا تو اس مباحثہ نے اس کو دین کے بارے میں شکوک وشبہات میں مبتلا کر دیا اور اس نے صفات کی نفی کی بدعت ایجاد کر لی۔(عقائد السلف، الرد علی الجهمية:٦٥،واللالكائی:٣/٣٧٩)

ان واقعات میں سے جو بھی واقعہ سچا ہو بات یہ ہے کہ یہ نظریہ خارجی اثرات کی وجہ سے پیدا ہوا ہے جس کی وجہ سے انہوں نے صفات باری تعالیٰ کو معطل مانا ہے۔جس طرح کہ یوحنا دمشقی کے اقوال بھی فکرِ اعتزال کیلئے ایک گھاٹ وچشمہ کی حیثیت رکھتے ہیں وہ بھی صالح واصلح کی بات کرتا تھا اور صفات کی ازلیت کا منکر اور انسانی رائے کی آزادی کا علمبردار تھا۔(المعتزلة زهری جارالله:٢٨)

خلق قرآن کا نظریہ سب سے پہلے جعد بن درہم نے ہشام کی خلافت میں (تقریباً ۱۲۰ھ) میں ظاہر کیا اور اس کے بعد بشر مریسی نے اس سے لیا یہ ایک یہودی رنگ ساز تھا۔(لالکائی:٣/٣٨٢،أثر:٦٤١)

تقدیر کی نفی کی بدعت معبد جہنی اور غیلان دمشقی کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوئی کہا جاتا ہے کہ یہ نظریہ ان دونوں نے سوسن نامی نصرانی سے لیا تھا۔(البداية والنهاية:٩/٣٤)

اس کے ہم خیال لوگوں کو قدریہ کہا جاتا تھا پھر معبد جہنی سے یہ خیال عمرو بن عبید نے لیا جو کہ معتزلہ کے سربراہ واصل بن عطاء کا ساتھی تھا(زهری جارالله،المعتزلة:٣٤،٣٥)

تقدیر کی نفی کا نظریہ شروع میں بہت ہی سادہ سا تھا اس میں کوئی فلسفہ نہیں تھا صرف یہ اعتقاد رکھنا کہ اللہ نے پہلے سے کوئی چیز مقرر ومقدر نہیں کی انسان اپنے افعال واعمال اپنی مرضی سے کرتا ہے اس میں اللہ کی مشیئت کا کوئی دخل نہیں ہے پھر اس نظریہ نے باقاعدہ مناقشہ ومخالفت اور مناظروں کی شکل اختیار کر لی خصوصًا پہلی صدی ہجری کے اختتام پر جب عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی خلافت تھی: کہا جاتا ہے کہ غیلان دمشقی نے ایک مرتبہ ربیعہ رای رحمہ اللہ کے پاس کھڑے ہو کر کہا: کہ کیا تم ہی وہ شخص ہو جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اللہ اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اُس کی نافرمانی کی جائے؟ جس پر ربیعہ نے اُس سے جواباً کہا: کیا تم ہی وہ شخص ہو جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اللہ کی چاہت کے بغیر ہی اُس کی نافرمانی کی جاتی ہے؟ (فجرالاسلام ،احمد امین:٢٨٥)

منزلۃ بین منزلتین کا قول سب سے پہلے واصل بن عطاء نے گھڑا۔یہ پہلا قول تھا جو باقاعدہ ایک فرقہ کی حیثیت سے معتزلہ کی طرف منسوب ہوا (گویا اس نظریہ نے معتزلہ کو ایک فرقہ کی صورت دی) یہ اس وقت کی بات ہے جب واصل بن عطاء نے حسن بصری رحمہ اللہ کی مجلس سے اِس کے بعد علیٰحدگی اختیار کی کہ جب حسن بصری رحمہ اللہ سے مرتکب کبیرہ کے بارے میں سوال ہوا تو وہ خاموش رہے واصل نے جواب دیا کہ مرتکب کبیرہ دو مرتبوں کے درمیان ایک تیسرے مرتبہ میں ہے نہ کافر نہ مؤمن اور اس کے ساتھ یہ بھی کہا کہ مرتکب کبیرہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔(الفرق بين الفرق بغدادی:١١٨)

اس طرح خوارج اور واصل کا قول موافق ہوا سوائے اس کے کہ واصل مرتکب کبیرہ کو کافر نہیں کہتا اسی وجہ سے معتزلہ کو خوارج کے مخنث کہا جاتا ہے۔

(الفرق بين الفرق بغدادی:١١٩)

❷ **معتزلہ کی ہیئت اول:** فکر معتزلہ ایک فرقے کی صورت میں سب سے پہلے بصرہ میں واصل بن عطاء (سنِ پیدائش ۱۳۱ ہجری) کے ہاتھوں وجود میں آیا واصل، حسن رحمہ اللہ کی مجالس میں شریک ہوتا تھا پھر واصل اور عمرو بن عبید نے مرتکب کبیرہ کے بارے میں یہ رائے اپنائی کہ وہ دو منزلوں کے درمیان ایک اور منزل ومرتبہ پر ہوتا ہے اور ہمیشہ کیلئے جہنمی ہو جاتا ہے مگر اُسے کافر نہیں کہا بلکہ فاسق کہا یہ حسن بصری رحمہ اللہ کی مجلس سے الگ ہو کر ایک اور ستون کے پاس جا کر بیٹھ گئے اس لیے انہیں معتزلہ (الگ ہونے والے) کہا گیا کیونکہ یہ امت کے سلف یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کے اجماعی عقیدے سے الگ ہو گئے۔(الفرق بين الفرق بغدادی:١١٨)

واصل نے وہی نظریات اپنا لیے جو اس سے قبل قدریہ نے معبد جہنی اور غیلان کی اتباع میں اپنائے تھے یعنی تقدیر کی نفی جیسا کہ صفات کی نفی میں اس نے جہم بن صفوان اور جعد بن درہم کے پیروکاروں (جہمیہ) کی موافقت کی (جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں) ایک ایسی صُورت میں جو کوئی مُستقل قاعدہ نہ تھی اور نہ وہ فلسفہ یا اُس کی مباحث میں سے کسی چیز سے مخلوط تھی فقط خارجی تاثیر ہی اس باطل فکر کو اپنائے اور اُسے اسلام پر مُنطبق کرنے کا سبب بنی جبکہ فلسفیانہ طریقہ کار بالا ہوتی مباحث کو اُن نظریات کے

اثبات کے لئے استعمال میں لاتے ہوئے اب تک واصل سے اِس سلسلے میں کوئی نقل اور اثر نہیں ملتا۔

❸ **دوسرا دور:** اس دور میں معتزلہ نے واضح طور پر فلسفی مباحث اور یونانی منہج کو اپنے ان موضوعات میں داخل کر دیا جن پر بحث کرتے تھے اور اپنے سے پیشتر بدعتی فرقوں کے اقوال کی طرف ان موضوعات کو منسوب کیا اس موقع پر آ کر علم کلام دو حصوں میں تقسیم ہو گیا: جلیل علم کلام اور دقیق علم کلام۔

① جلیل علم کلام سے مراد ہے اللہ کی صفات، کلام، قدرت، ارادہ ایمان وغیرہ پر بحث کرنا اس میں یہ شامل ہے تخلیق، آجال، ارزاق، ثواب، عقاب، ختم (مہر)، طبع، ہدایت، گمراہی وغیرہ یہ وہ موضوعات ہیں جنہیں دور اول میں چھوڑ دیا گیا تھا۔

② دقیق الکلام سے مراد ہے وہ کلام جو اس دور میں مکمل طور پر پروان چڑھا اس میں جن اشیاء سے بحث کی جاتی ہے وہ ہے۔ جوہر، عرض، جسم اور اس کے حدود، اضداد، علل، ارادہ، تولد وغیرہ ایسے مباحث جن پر یونانی فلسفہ کا رنگ غالب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان موضوعات پر متاخرین معتزلہ کے ہی اقوال ملتے ہیں جیسے کہ اسکافی، معمر، ابوالحسین الصالحی وغیرہ جبکہ واصل بن عطاء اور اس کے دیگر ہمعصر افراد میں اس موضوع پر کوئی کلام نہیں پایا جاتا۔ ہم یہاں متاخرین معتزلہ کے کچھ اقوال پیش کرتے ہیں جن سے ہماری بات کی تائید ہو جائے گی کہ یہ تبدیلی ان میں وقت کے ساتھ آتی رہی ہے۔

ابوالہذیل العلاف (۲۳۵ھ) کہتا ہے:

☆ اللہ کی مقدورات فنا ہو جاتے ہیں پھر وہ مقدورات کے فنا ہونے کے بعد کسی چیز پر قادر نہیں ہوتا!! یعنی جب وہ چاہتا ہے کچھ چیزیں پیدا کرتا ہے مگر پھر ان کے بعد کسی چیز کی تخلیق پر قادر نہیں ہوتا۔ (الفرق بین الفرق للبغدادی: ۱۲۲)

☆ کہتا ہے: جہنمیوں کا عذاب اور جنتیوں کی نعمتیں ختم ہو جائیں گی یہاں تک کہ دونوں طبقات کے رہنے والے اپنی اپنی جگہ ساکن رہ جائیں گے حرکت نہ کر سکیں گے!

☆ کہتا ہے: اہل جنت و اہل جہنم اپنے اقوال و افعال میں بے بس ہوں گے آخرت میں ان کے پاس کوئی اختیار نہ ہوگا۔ یہ عجیب تناقض و تضاد ہے اس کے قول میں، کہ دنیا میں لوگ جو چاہیں کہیں یا کریں آزاد و مختار ہیں اور آخرت میں مجبور و بے اختیار ہوں گے!! دنیا میں یہ قدری ہے اور آخرت کے لحاظ سے جبری ہے۔ (مذاھب الاسلامیین: ۱۳۳)

☆ کہتا ہے: وہ تواتر حجت بنے گی جس پر بیس آدمی نے اجماع کیا ہو اور ان میں سے ایک اہل جنت میں سے ہو۔ (یعنی معتزلی ہو)!

☆ کہتا ہے: کہ میت دلی امور انجام نہیں دے سکتی مگر جوارح کے امور و افعال پر قادر ہے جبکہ جبائی اور اس کا بیٹا اس کے برعکس کہتے ہیں: کہ میت دل و جوارح دونوں کے امور انجام دے سکتی ہے۔ (الفرق بین الفرق: ۱۲۱، ۱۳۰)

یہی وہ شخص تھا جس نے سب سے پہلے یہ بات کی تھی کہ اللہ ایسے علم کے ساتھ عالم ہے جو اس کی ذات ہے اور اللہ کی قدرت سے مراد وہی اللہ ہے۔ دقیق علم کلام میں یہ ابوالہذیل العلاف نے جو کہا وہ یونانی فلسفہ سے متاثر ہوتے ہوئے جسم کے متعلق کہا ہے لہٰذا اُس نے جسم کو یوں موصوف کیا کہ وہ لمبا، چوڑا، گہرا ہوتا ہے۔ (مقالات اسلامیین: ۲/۸) جوہر فرد کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ ایسا جزء ہے جس کی تقسیم نہیں ہو سکتی، اس کے لیے نہ طول ہے، نہ عمق، نہ عرض ہے، جس میں کوئی چیز ملتی نہیں اور نہ کوئی چیز اُس سے جدا ہوتی ہے ہاں اس کیلئے جائز ہے کہ غیر کو اپنے ساتھ ملائے یا علیحدہ کرے۔ رائی کو دو حصوں میں تقسیم کرنا پھر چار میں پھر آٹھ میں ممکن ہے اور تقسیم کرتے کرتے اس حد کو پہنچ جائیں کہ پھر مزید تقسیم قبول نہ کرے۔ جوہر کی یہ تعریف تقریباً وہی ہے جو علم ریاضی میں نقطہ کی ہے۔ نظام نے اس مسئلہ میں ابوالہذیل کی مخالفت کی ہے اور ایسے کسی جزء کو تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے جو تقسیم قبول نہ کرتا ہو وہ کہتا ہے کہ ہر جزء لا متناہی تقسیم قبول کرتا ہے۔

ہم علم ریاضی کے پہلو سے جسم کے معنی میں بحث کرنے سے اعتراض نہیں کرتے یا اجزاء و اقسام کی بابت اُن کے تصورات سے، ان سے اختلاف یا اتفاق کوئی معانی نہیں رکھتا ہمیں اعتراض صرف یہ ہے کہ ان اصطلاحات اور مباحث کو جو فلسفہ سے مخصوص ہو، اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ گڈمڈ کیا جا رہا ہے جو ان لوگوں کو شیطانی دیوانہ پن اور خالق و مخلوق میں اختلاط اور بدعت کی طرف لیجاتا ہے۔

☆ اعراض کے بارے میں علاف کہتا ہے: کچھ اعراض ایسی ہیں جو باقی رہتی ہیں کچھ ایسی ہیں جو زائل ہو جاتی ہیں۔ جو زائل ہوتی ہیں اُس کی مثال اجسام کی حرکات ہیں۔ اس نظریہ کی وجہ سے ہی اس نے کہا ہے: اہل آخرت کی حرکات بھی زائل ہو جائیں گی اور جو باقی رہتی ہیں جیسے سکون ہے جس کی طرف حرکت کے بعد یہ جائیں گے۔ (مقالات اسلامیین: ۱۹۰)

☆ کبھی کہتا ہے کہ اعراض کو بھی دیکھنا ممکن ہے مثلاً حرکات، سکنات، رنگ، مِلنا، علیحدہ ہونا وغیرہ اعراض کو چھونا بھی ممکن ہے اور یہ اس طرح ممکن ہے کہ اس جسم کو چھوا جائے جس کو اعراض لاحق ہیں۔

☆ جبائی نے اعراض کو چھونے والے مسئلہ میں علاف کی مخالفت کی ہے البتہ انہیں دیکھنے میں موافقت کی ہے۔

☆ اور نظام نے اعراض اور الوان کو دیکھنے اور اس کے چھونے کے مسئلے میں ان دونوں کی مخالفت کی ہے اور کہا ہے کہ جس چیز کا دیکھنا ممکن ہو وہ تو جسم کہلاتا ہے۔

☆ خلق کے متعلق علاّف نے کہا کہ بلاشبہ کسی شے کی خلقت اُس ہی شے کا غیر ہے اور خلقت کا اعادہ اُس اعادہ کی جانے والی شے کا غیر ہے اور خلق کا ارادہ یہ پیدا کی جانے والی شے کا غیر ہے جبکہ نظام نے اس بارے میں اس کی مخالف کرتے ہوئے کہا: بلکہ خلق ہی نفس شے ہے اور مخلوق سے کا ارادہ ہی مخلوق شے ہے مگر جب وہ ارادہ امر ہو تب وہ امر کا غیر ہے۔(مقالات اسلامیین:۱۹۱)

☆ **تولد:** بشر بن معتمر (۲۱۰ھ) وہ پہلا معتزلی تھا۔(مقالات اسلامیین:۱۹۶)

جس نے تولد کی بات کی اور اس میں بہت مبالغہ سے کام لیا اس نے کہا: کہ انسان کے افعال کے جتنے متولدات ہیں ہوسکتا ہے کہ ان کے رنگ بھی ہوں، ذائقہ ہو، انہیں دیکھا اور سونگھا جاسکتا۔ (الفرق بین الفرق للبغدادی:۱۵۷)

☆ نظام کہتا تھا: متولدات سب کے سب اللہ کے افعال ہیں اس لیے کہ اللہ نے چیزیں پیدا کی ہیں تو ان کی طبیعتیں بھی ہیں جو افعال میں ان کے تابع ہیں اور وہ ان پر ہی چلتی ہیں۔

☆ ابوالہذیل کہتا ہے: انسان کے کسی فعل سے متولد ہونے والے افعال انسان کے ہی افعال شمار ہوں گے یہاں تک کہ اگر وہ ان کے اثرات ظاہر کرنے سے پہلے مرگیا تب بھی ان کی نسبت انسان کی طرف حقیقی ہی ہوگی مجازی نہ ہوگی جب تک کہ وہ ان کی کیفیت سے باخبر ہو جیسا کہ ضرب کی وجہ سے الم کے حدوث کا ذمہ دار ضارب انسان ہے اور انسان کا پہاڑ سے پتھر لڑھکانا پس اگر یہ انسان پتھر کو اٹھاتے ہی فوراً مرجائے اور یہ پتھر گر کر ایک شخص کو مارڈالے تو یہی پتھر اٹھانے والا حقیقتاً اُس کا قاتل ہے۔ اور جس چیز کی تاثیر کی کیفیت سے انسان واقف نہیں ہے مثلاً لذت، بھوک، سیر ہونا۔ بزدلی وغیرہ تو یہ سب اللہ کے افعال شمار ہوں گے۔

☆ ابراہیم نظام کہتا ہے: ایک جزء ایسا ہے جو تقسیم قبول نہیں کرتا (ایٹم) مگر علاف اس کی مخالفت کرتا ہے وہ طفرۃ کا قائل ہے یعنی ایسا ہوسکتا ہے کہ ایک جسم کیلئے ممکن ہے کہ وہ نقطہ الف پر گزر جائے اور پھر نقطہ ج میں پایا جائے نقطہ ب پر گذرے بغیر یعنی پہلے سے تیسرے درجے میں جائے درمیان میں دوسرا درجہ چھوڑ کر (طفرۃ کہتے ہیں کودنے کو، چوٹی سے وادی کی گہرائی میں اس طرح چھلانگ لگانا کہ پہاڑ کے اس حصے کو نہ چھوا جائے جو چوٹی اور وادی کی گہرائی کے درمیان ہے۔ مترجم) یہ قول ابراہیم نظام کے عجیب باتوں میں سے ایک ہے یہاں تک کہ لوگ کہتے تھے کہ دنیا کے عجوبوں میں سے نظام کا طفرہ اور اشعری کا کسب ایک عجوبہ ہے۔ نظام اس طرح کی عجیب بات کہنے پر اس لیے مجبور ہوا کہ اس نے پہلے جزء لا یتجزء کا نظریہ اپنایا کہ کوئی جسم ایسا بھی ہوتا ہے جو تقسیم قبول نہیں کرتا۔ اس نے کہا: جب روح جسم سے الگ ہوجاتی ہے تو وہ دنیا سے مکمل طور پر عالم علوی کی طرف منتقل ہوجاتی ہے اور یہ عمل ایک محدود وقت میں ہوتا ہے اور اگر رُوح کا اِس عالم سے مُنتقل ہونا یہ لامتناہی اجزاء کے درمیان سے گزرتا تو جب روح دوران انتقال ایک اجزاء طے کرتا تو دوسرا اجزء باقی رہتا تو یہ کیسے ہوسکتا کہ روح ایک لامتناہی (مقدار کو) ایک متناہی محدود وقت میں یہ سفر طے کرتا!؟۔ اس وجہ سے اس نے کہا کہ طفرۃ ایک حقیقت ہے!! (یعنی روح یکدم دنیا سے عالم علوی کی طرف چھلانگ لگاتی ہے وہ وقت کے ساتھ ساتھ نہیں چلتی)

☆ اسی طرح وہ کہتا ہے کہ بہت زیادہ عدل کرنے والا اور سچ بولنے والا ظلم وجھوٹ پر قدرت نہیں رکھتا۔ اللہ جنت کی نعمتوں میں کمی کرنے پر قادر نہیں ہے نہ ہی وہ جہنم کی آگ میں اضافہ کرسکتا ہے!! (یہ قول دراصل ان کی اصطلاح صالح واصلح کے تحت آتا ہے)

☆ یہ کہتا ہے: قرآن کا اعجاز صرف غیب کی خبروں کی وجہ سے ہے اس کی ترتیب ونظم کی وجہ سے نہیں ورنہ اس طرح مرتب ومنظّم کلام کہا جاسکتا ہے مگر اللہ نے بشر کو اس طرح کرنے سے بھی پھیر دیا ہے! الصرفہ، یعنی پھیرنا یہ اس کی مشہور اصطلاح ہے۔

☆ اس نے اجماع اور قیاس کو حجت ماننے سے انکار کیا ہے اس بات سے بھی انکار کیا ہے کہ تواتر سے علم کا فائدہ ہوتا ہے۔

☆ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر بھی اس نے طعن کیا ہے۔

☆ اس نے کہا: اگر آگ آلائشوں سے پاک ہو تو یہ آسمانوں یہاں تک کہ عرش سے بھی اوپر جا سکتی ہے۔ (اس بات سے مجوسیت واضح طور پر مترشح ہے) (الفرق بین الفرق للبغدادی:۱۳۱،۱۵۰)

معمر بن عباد (۲۲۰ھ) رشید کے دور حکومت میں بصرہ میں تھا۔

☆ یہ کہتا تھا کہ اللہ نے اعراض اور اجسام کی صفات کو پیدا نہیں کیا یہ بات کہنے والا یہ پہلا شخص تھا یہ کہتا تھا کہ یہ صفات واعراض اجسام نے پیدا کی ہیں۔

☆ اس نے ایک اور منفرد بات کی تھی کہ انسان یہ جسم نہیں ہے جسے ہم محسوس کر رہے ہیں بلکہ وہ ہے جو قادر ہے، مختار ہے مگر متحرک یا ساکن (حرکت کرنے والا، یا ساکت) نہیں ہے نہ اسے محسوس کیا جا سکتا ہے نہ دیکھا اور چھوا جا سکتا ہے نہ ایک مکان سے دوسرے مکان میں منتقل ہو سکتا ہے۔

☆ کسی نے سوال کیا کہ یہ انسان آسمان میں ہے یا زمین میں جنت میں ہے یا جہنم میں؟ اس نے کہا میں مطلق طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ یہ کہتا ہوں کہ وہ جسم میں تدبیر کرنے والا۔ جنت میں نعمتیں حاصل کرنے والا، جہنم میں عذاب سہنے والا ہے مگر ان اشیاء میں نہ داخل ہے نہ ان میں متمکن (براجمان) ہے۔ (الفرق بین الفرق للبغدادی:۱۵٤)

ہشام بن عمرو الفرطی نے بصرہ میں تعلیم حاصل کی، مامون عباسی کے درباریوں میں سے تھا دوسری صدی ہجری کے آخر میں۔ اس نے بہت بے ہودہ باتیں کی ہیں جن میں چند مندرجہ ذیل ہیں:

☆ یہ کہتا تھا کہ وکیل کا لفظ اللہ کیلئے استعمال نہیں کرنا چاہیے جیسا کہ آیت میں ہے ﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾ "ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے" یہ کہتا تھا کہ یہ بھی نہ کہو کہ اللہ نے مؤمنوں کے دلوں میں الفت پیدا کی حالانکہ اللہ نے فرمایا ہے: ﴿اَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ﴾ "کہ اللہ نے ان کے دلوں میں الفت پیدا کی۔"

ابو موسیٰ المردار (۲۲٦ھ) بغداد کا تعلیم یافتہ تھا اس نے تکفیر (کافر قرار دینے) میں بہت وسعت سے کام لیا ہے یہاں تک کہ پوری امت کو کافر قرار دیا ہے معتزلہ سمیت اس نے اس شخص کو کافر قرار دیا ہے جو کہتا ہے کہ اللہ کو آخرت میں دیکھا جا سکے گا، اس کو بھی کافر کہا ہے جو کہتا ہے بندوں کے اعمال اللہ کے پیدا کردہ ہیں اور اس کو بھی کافر قرار دیا ہے جو حکام کے پاس جاتا ہے ان سے کسی قسم کا تعلق رکھتا ہے یا ان کے ساتھ کام کرتا ہے! ایک مرتبہ ابراہیم بن السندھی نے ان سے زمین میں رہنے والے سب لوگوں کے بارے میں سوال کیا تو اس نے کہا سب کافر ہیں۔ ابراہیم نے کہا کہ جس جنت کی وسعت آسمانوں اور زمینوں کے برابر ہے کیا اس میں صرف تم اور تمہارے تین ماننے والے جائیں گے؟۔

(ضحی الاسلام احمد أمین:۳/۱٤۷)

اس نے بھی نظام اور جاحظ کی طرح یہ کہا ہے کہ قرآن کی طرح کلام بنایا جا سکتا ہے!

(الفرق بین الفرق للبغدادی:۱٦٥)

ثمامہ بن اشرس (۲۳٤ھ) بغداد کا تعلیم یافتہ تھا۔ مامون عباسی سے قربت رکھتا تھا یہ بھی اپنی آراء کی وجہ سے اپنے ساتھیوں سے مختلف تھا یہ کہتا تھا کہ عام مشرکین قیامت کے دن حیوانات کی طرح مٹی ہو جائیں گے متولد افعال کا کوئی فاعل نہیں ہوتا۔ (الفرق بین الفرق للبغدادی:۱۷۳،۱۷٤)

نمازیں کثرت سے ترک کرتا تھا۔ جاحظ نے بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ ثمامہ کے غلام نے اس سے کہا کہ نماز کا وقت ہو گیا اٹھ کر نماز پڑھیے۔ اس نے توجہ نہیں دی۔ غلام نے کہا: وقت کم رہ گیا ہے آپ اٹھ کر نماز پڑھ لیں پھر آرام کریں ثمامہ نے کہا: اگر تم مجھے چھوڑ دو تو میں آرام سے ہی ہوں! (الفرق بین الفرق للبغدادی:۱۷٤)

☆ اس کا یہ بھی قول مشہور ہے کہ عالم اللہ کی طبیعت سے پیدا کیا گیا ہے۔ یہ ان کے اس نظریے کے خلاف قول ہے کہ اجسام حادث ہیں اس قول سے عالم کے قدیم ہونے کا نظریہ سامنے آتا ہے۔ (ضحی الاسلام:۳/۱٤۹)

جاحظ (۲۵٦ھ) بصرہ سے تعلیم حاصل کی تھی اس کی شہرت تصنیف وبلاغت کی وجہ سے تھی اس نے اپنی تصانیف میں اعتزال کو داخل کیا ہے۔ اس کے بھی اپنے دیگر ساتھیوں کی طرح بدعتی اقوال ہیں۔

☆ یہ کہتا تھا: اللہ کسی کو جہنم میں داخل نہیں کرے گا بلکہ آگ میں جذب وکشش کی جو صلاحیت ہے وہی لوگوں کو کھینچے گی آخر میں جہنمی خود ہی آگ کی حیثیت وطبیعت اختیار کرلیں گے۔(الفرق بين الفرق للبغدادي:١٧٦،ضحى الاسلام:٣/١٤٥)

☆ کہتا ہے: کفار، یہود، عیسائی اگر چاہیں بھی تو حق کو نہیں پہچان سکتے ان میں اس کی استطاعت ہی نہیں یہ اس بارے میں معذور ہیں گناہگار نہیں ہیں۔

(ضحى الاسلام احمد امين:٣/١٣٥)

ابوالحسن الخیاط (۲۹۰ھ) بغداد کا تعلیم یافتہ تھا۔اس کی ایجاد کردہ بدعت یہ تھی وہ کہتا تھا: معدوم بھی جسم ہے، شیئ معدوم عدم سے قبل جسم تھا۔یہ عالم کو صراحت کے ساتھ قدیم ماننا ہے۔یہ لوگ اپنے ہی مذہب کی مخالفت کررہے ہیں۔صالحی کہتا ہے: معدوم کچھ بھی نہیں ہے۔جبائی کہتا ہے: معدوم کوئی شیئ ہے۔جوہر اپنی حالت عدم میں بھی جوہر تھا۔عرض حالت عدم میں بھی عرض تھا۔اسی طرح کالا، سفید وغیرہ بھی، البتہ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ معدوم کیلئے جسم کا لفظ استعمال نہیں کیا جاسکتا مگر خیاط نے یہ بھی کہہ دیا کہ معدوم کو جسم کہا جاسکتا ہے۔ہم ان کے تفصیلی اقوال قلمبند نہیں کرنا چاہتے وہ مختلف کتب میں پھیلے ہوئے ہیں۔ان تمام مذکورہ اہم گمراہ افراد میں سے پھر ہر ایک کے کچھ متبعین ہیں۔مثلاً واصلون، ثمامیون، نظامیون، جاحظیون، خیاطون وغیرہ یہ سب الگ الگ گمراہ فرقے بن چکے ہیں ہم نے صرف ان کے گمراہ کن اقوال ونظریات اختصار کے ساتھ پیش کردیئے ہیں بقیہ تفاصیل کو ان پر قیاس کیا جاسکتا ہے۔

معتزلہ کے سیاسی مراحل

اگرچہ دوسری صدی ہجری میں معتزلہ ایک فکری فرقہ کے طور پر نمودار ہوئے تھے مگر وقت کے ساتھ ساتھ ان کے اثرات سیاست پر بھی پڑ گئے اور ان کے اپنے سیاسی اہداف ومقاصد سامنے آئے خاص کر عباسی، بویہی اور شیعہ حکومتوں کے تبدیلیوں کے دوران۔معتزلہ کے سیاسی ادوار کو اس طرح تقسیم کیا جاسکتا ہے:

1. پہلا مرحلہ: اموی دور میں بطور ایک فرقہ کے ابھرنا
2. عباسی دور میں
3. متوکل کے دور میں (جب معتزلہ کمزور ہوگئے تھے)
4. بویہی دور میں (جب انہوں نے دوبارہ طاقت حاصل کی)
5. باقاعدہ ایک فرقہ کے طور پر دوسرے فرقوں کے برابر آجانا

(پہلا مرحلہ) اموی دور

معتزلہ نے ایک مستقل فرقے کی صورت دور اموی میں حاصل کی تھی اس حکومت کے خلاف جو کچھ ہوا، جو تحریکیں چلیں ان میں قدریہ جہمیہ اور معتزلی شیوخ کا بہت بڑا کردار تھا۔امویوں کے خلاف اس کردار کے بدلے انہوں نے بہت کچھ حاصل کیا تھا سب سے پہلا منکر تقدیر معبد جہنی نے عبدالرحمٰن بن اشعث کے ساتھ ملکر عبدالملک بن مروان کے خلاف بغاوت کی اور یہ اتنی کامیاب ہوئی کہ اموی حکومت کا خاتمہ کرنے والی تھی کہ حجاج بن یوسف نے اس کو قتل کردیا اور اس بغاوت کو (۸۰ھ) میں ناکام بنادیا۔اسی طرح جہم بن صفوان نے جو کہ صفات باری تعالیٰ کا منکر اول تھا حارث بن سریج کے ساتھ مل کر بنوامیہ کے خلاف بغاوت کی اس کو سالم بن احوز نے مرو مقام پر (۱۲۸ھ) میں قتل کیا اور بغاوت کو ناکام بنادیا۔(ضحى الاسلام احمد امين:٣/١٦٢)

غیلان دمشقی اور عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے درمیان بھی بحث ہوتی رہتی تھی خاص کر تقدیر کے بارے میں پھر یہ ایک وقت تک خاموش رہا، جب عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا انتقال ہوا اس کے بعد اس نے اپنی بدعت پایہ تکمیل تک پہنچائی یہاں تک کہ امیر المؤمنین ہشام بن عبدالملک نے اسے قتل کردیا۔

جعد بن درہم کو خالد بن عبداللہ القسری والی کوفہ نے قتل کیا خالد بن عبداللہ نے عیدالاضحیٰ کے دن منبر پر اعلان کیا: کہ جاؤ قربانیاں کرو میں جعد بن درہم کی قربانی کروں گا اس لیے کہ وہ کہتا ہے کہ اللہ نے ابراہیم علیہ السلام کو خلیل نہیں بنایا تھا، اللہ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام نہیں کیا تھا۔پھر منبر سے اترا اور جعد بن درہم کو قتل کیا۔

(عقائد السلف للنشار:١١٨ عن كتاب خلق أفعال العباد للبخاري)

واصل بن عطاء نے حسن بصری رحمہ اللہ کی مجلس سے علیحدہ ہوکر منزلۃ بین المنزلتین کا نظریہ ایجاد کیا اور ایک فرقہ کی بنیاد رکھی معبد اور جہم کی متابعت میں اس نے بھی

صفات وقدر کی نفی کا نظریہ پیش کیا اس کی پیروی پھر عمرو بن عبید نے کی ۔(۱۴۳ھ)(۱۳۱ھ،لسان المیزان :٦/٢١٤)
یزید بن ولید اموی خلیفہ جو کہ یزید ناقص کے نام سے مشہور تھا اس کا دور خلافت معتزلہ کے نشاط ثانیہ اور واضح تبلیغ کا دور تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ اس یزید ناقص کو خلافت دلانے میں معتزلہ نے اہم کردار ادا کیا تھا یہ یزید بھی قدری ہی تھا اس نے غیلان دمشقی کے لوگوں کو اپنے قریب رکھا معتزلہ نے اس یزید ناقص کی مدد اس وقت کی جب وہ ولید بن یزید بن عبدالملک سے حکومت چھیننے کی کوشش کر رہا تھا۔اسی طرح جعد بن درہم اموی خلفاء میں سے مروان بن محمد کا مربی تھا یہاں تک کہ لوگ مروان بن محمد کو مروان جعدی کہتے تھے۔
اعتزال کی دعوت پھیلانے میں واصل کا بہت اہم کردار تھا اس نے مختلف ممالک اور شہروں میں باقاعدہ مبلغین بھیجے،عبداللہ بن الحارث کو یورپ بھیجا،حفص بن سالم کو خراسان،قاسم کو یمن حسن بن ذکوان کو کوفہ،عثمان الطّویل کو ارمینیہ(المنیة و الامل:١٤١)اس تحریک کی کامیابی میں ان مذکورہ داعین کا بھی اثر تھا اگر چہ ان میں سے بعض نے تو اس دعوت کو بہت زیادہ پھیلانے ، بہت سے پیروکار بنانے ، بہت سے لوگوں کا اپنے نظریات کے قائل ہونے کا دعویٰ کیا ہے ان کی دعوت عقلی دعوت تھی جس میں فلسفیانہ الفاظ ومعانی استعمال ہوتے تھے اس لیے دعوت کو وسیع ہونے کا دعویٰ صرف مبالغہ آرائی ہے اس لیے کہ فلسفیانہ مباحث عوام کی سمجھ سے بالا تھے سوائے چند شعراء واد باء یا خلفاء کے عوام الناس ان سے زیادہ متاثر نہیں ہوئے پھر یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ ان کے مقابلے پر علماء اہل سنت وائمہ کی کثیر تعداد موجود تھی ان کے دلائل قوی تھے اور عوام کی سمجھ میں آنے والے تھے وہ مسلسل عوام کو گمراہی کے اس گڑھے میں گرنے سے بچاتے رہے جیسا کہ امام مالک رحمہ اللہ نے رحمٰن کے عرش پر مستوی ہونے کے سوال کرنے والے کو مسجد سے باہر پھینکنے کا حکم دیا تھا۔

(دوسرا مرحلہ) عباسی دور

عباسیوں کا پہلا دور دراصل اعتزال کے پھلنے پھولنے کا دور شمار ہوتا ہے ۔اسی دور میں اس مذہب کے بڑے بڑے شیوخ بصرہ وبغداد میں رہے ۔ابو جعفر منصور کے دور میں عمرو بن عبید تھا ان دونوں کے باہم اچھے تعلقات تھے یہی وجہ ہے کہ جب ابو جعفر کے خلاف محمد بن عبداللہ بن حسن جو نفس زکیہ کے لقب سے مشہور تھا بغاوت کی کوشش کی تو اس نے عمرو بن عبید سے مدد مانگی مگر عمرو نے نفس زکیہ کا ساتھ دینے کے بجائے ابو جعفر کا ساتھ دیا ۔رشید کے دور میں معتزلہ کو پریشانیوں کا سامنا اس لیے کرنا پڑا کہ رشید ان سے نفرت کرتا تھا،ان کے اصولوں کو پسند نہیں کرتا تھا اس نے علم کلام پر پابندی لگائی اور متکلمین کو قید کرنے کا حکم دیا۔شاعر عتابی،ثمامہ بن اشرس معتزلی گرفتار ہو گئے بعد میں رشید نے ثمامہ کو اپنا ساتھی بنالیا تھا اگر چہ اس کا مذہب اختیار نہیں کیا تھا۔اسی طرح بشر مریسی پورے دور خلافت رشید میں چھپا رہا۔
(ضحی الاسلام احمد امین:٣/١٦٢)

رشید اس شخص کو قتل کراتا تھا جو خلق قرآن کا قائل ہوتا۔(البداية والنهاية،لابن كثير:١٠/٢١٥)

جب مامون عباسی کا دور آیا تو بشر مریسی نے اس کے سامنے مذہب اعتزال بڑا خوشنما بنا کر پیش کیا۔(البداية والنهاية،لابن كثير:١٠/٢٧٥)
تو اس نے بشر کو گلے لگالیا،ثمامہ بن اشرس کو بھی اپنا اتنا قریبی آدمی بنالیا یہاں تک حالت ہوگئی کہ اس کی مرضی کے بغیر کسی قسم کا فیصلہ نہیں کرتا تھا بلکہ وہی خلیفہ کیلئے وزراء کا انتخاب کرتا تھا پہلے اس کیلئے احمد بن ابی خالد کو اس کے بعد یحییٰ بن اکثم کو وزیر بنایا۔اسی طریقہ پر ابوداؤد جو کہ روساء معتزلہ میں سے تھا وہ بھی مامون کے زمانہ میں مشہور ہوا۔یہی احمد بن داؤد فتنۂ خلق قرآن کا سرغنہ تھا معتصم کے دور خلافت میں قاضی کے عہدے پر فائز ہوا۔(ابن كثير، البداية والنهاية:١٠/٢٤٩)
مامون پر ان کا اتنا اثر تھا کہ یہ اعلانیہ اعتزال کا اظہار کرنا چاہتا تھا ثمامہ اور احمد اس کو اس بات پر اکساتے رہتے تھے قریب تھا کہ مامون منبر پر امیر المؤمنین معاویہ رضی اللہ عنہ پر لعنت بھیجنا شروع کر دیتا مگر اس کے قاضی یحییٰ بن اکثم اور وزیر یزید بن ہارون اسے منع کرتے رہے جب یزید بن ہارون کا انتقال ہوگیا اور یحییٰ بن اکثم وزارت سے سبکدوش ہوا تو فضا ثمامہ اور احمد کیلئے سازگار ہوئی اس وقت مامون نے اعتزال کا اعلان کیا اس وقت پھر خلق قرآن کا فتنہ شروع ہوا۔یہ بھی تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ مامون کی آراء میں بہت جلد تبدیلی آئی تھی پہلے اس نے علی رضی اللہ عنہ کو ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما پر فضیلت دینے کا اعلان کیا بلکہ اپنے دور میں اپنے بعد اہل بیت کے اس وقت کے امام علی رضا بن موسیٰ کاظم بن جعفر صادق کی بیعت بھی لے لی تھی۔عباسیوں کے شعار ونشانی کالی پگڑی ولباس کو اتار کر علوی لباس سبز پگڑی وجبہ زیب تن کرنا شروع کیا تھا۔جب (۲۰۱ھ) میں علی رضا کا انتقال ہوا۔(ابن كثير، البداية والنهاية:١٠/٢٤٩)

تو یہ اہل بیت کی بیعت سے پھر گیا۔ابن کثیر کہتے ہیں:اس میں تشیع،اعتزال اور سنت صحیحہ سے لاعلمی تینوں صفات موجود تھیں۔(ابن کثیر، البداية والنهاية: ۱۰/۲۷۳)
تشیع اور اعتزال میں گہرا تعلق ہے جیسا کہ بعد میں واضح ہوگا۔مامون کے بعد معتصم بھی اعتزال کے مذہب پر چلتا رہا اس کے بعد واثق بھی اور فتنہ خلق قرآن مامون کے دور(۲۱۸ھ) میں شروع ہو۔

فتنہ خلق قرآن

اسی سال(۲۱۸ھ) مامون نے اپنے عقیدے خلق قرآن کا اعلان کیا اور دوسرے لوگوں کو بھی اس عقیدے پر قائل کرنا چاہا اس بارے میں اس نے فقہاء،قاضیوں اور علماء کا امتحان لینا شروع کیا انہیں پابند کیا کہ وہ اپنے عقائد کی وضاحت پیش کریں۔اس نے بغداد میں اپنے نائب اسحاق بن ابراہیم کو حکم دیا کہ وہ اپنے عمّالِ حکومت اور علماء وفقہاء اور قاضیوں کے عقائد کی چھان بین کرے جو خلق قرآن کا قائل ہو اسے عہدے پر برقرار رکھے اور جو قائل نہ ہو اسے معزول کردے اور بیت المال سے جو تنخواہ وصول کرتا تھا وہ ختم کردے۔اہل سنت کے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اس دھمکی میں آنے سے انکار کردیا اس نے حق کے علم کو بلند رکھنے کو ترجیح دی۔ایسے معاملات میں پختہ عزم وارادہ اولین شرط ہوتی ہے اور کلمۂ حق کو بلند کرنا ان لوگوں کا شیوہ ہوتا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ دوسرے لوگوں کیلئے ایک مثال بنانا چاہتا ہے،لوگوں کی رہنمائی کیلئے روشنی کا مینار بنانا چاہتا ہے اور احمد بن حنبل رحمہ اللہ انہی میں سے تھے۔
مامون نے بغداد حکم بھیجا کہ جو عالم میری(بدعتی) رائے کو نہیں اپناتا انہیں میرے پاس حاضر کیا جائے۔یہ چار علماء تھے ایک احمد بن حنبل رحمہ اللہ دوسرے محمد بن نوح رحمہ اللہ تیسرے حسن بن حماد اور چوتھے عبیداللہ بن عمرو القواریری۔
ان چاروں میں سے حسن بن حماد اور عبیداللہ بن عمرو نے مامون کے سامنے سر جھکا لیا اس کی دھمکی سے مرعوب ہوگئے مگر امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور محمد بن نوح رحمہ اللہ نے انکار کردیا۔ان دونوں کو بغداد منتقل کردیا گیا راستے میں انہیں مامون کی موت کی اطلاع مل گئی اور معتصم اس کے بعد خلیفہ بنا تو یہ دونوں بغداد آگئے راستے میں محمد بن نوح رحمہ اللہ کا انتقال ہوگیا احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اس کی نماز جنازہ ادا کی۔احمد بن حنبل رحمہ اللہ کو بغداد کے جیل میں ڈال دیا گیا وہاں تقریباً ڈھائی سال قید رہے۔
اس دوران احمد بن داؤد مسلسل معتصم کو احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے خلاف اکساتا رہا یہاں تک کہ معتصم نے احمد بن حنبل رحمہ اللہ کو اپنے دربار میں پیش کرنے کا حکم صادر کردیا وہاں امام صاحب کا احمد بن داؤد سے مناظرہ ہوا امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اسے شکست دی مگر خواہشات اور باطل نظریات نے غلبہ اس طرح حاصل کرلیا کہ احمد بن داؤد وغیرہ نے خلیفہ کو یہ باور کرادیا کہ اگر عوام کو معلوم ہوا کہ احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے دو خلیفہ کو شکست دی ہے(ایک مامون،ایک معتصم) تو عوام حکومت کے مخالف ہوجائیں گے حکومت خطرے میں پڑ جائے گی لہٰذا معتصم نے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کو ۸۰ کوڑے مارنے کا حکم جاری کردیا ان کوڑوں کی وجہ سے امام صاحب کے جسم کا گوشت جگہ جگہ سے پھٹ گیا پھر انہیں واپس بھیج دیا گیا وہاں وہ معتصم پھر واثق پھر متوکل کے دور تک رہے واثق کے دور میں جن علماء کو مصائب ومشکلات کا شکار ہونا پڑا ان میں احمد بن نصر المروزی رحمہ اللہ،یہ بہت بڑے عالم،بااخلاق وملنسار آدمی تھے یہ سنت پر قائم تھے،یہ کہتے تھے قرآن مخلوق نہیں ہے بلکہ اللہ کا کلام ہے واثق نے ان کا امتحان لیا تو ان کا یہ عقیدہ ظاہر ہوا۔واثق کے خلاف احمد بن نصر رحمہ اللہ نے بغاوت کی بھی کوشش کی مگر وہ ناکام ہوئی واثق نے انہیں(۲۳۱ھ) میں اپنے ہاتھ سے قتل کیا۔(البداية والنهاية:۱۰/۳۰۳،وفي أخبار المحنة:۱۰/۳۳۰)

(تیسرا مرحلہ) معتزلہ متوکل کے دور میں

جب(۲۳۲ھ) میں متوکل نے خلافت سنبھالی تو اس نے سنت کی مدد کرنے کا عزم ظاہر کیا ۔اس نے نظریہ خلق قرآن کے اظہار اور علم کلام میں بحث کرنے پر پابندی لگادی کہ اگر کسی نے بات کی تو اسے عمر قید کی سزا دی جائے گی یہاں تک کہ وہ جیل میں ہی مرجائے۔لوگوں کو حکم دیا کہ صرف کتاب وسنت میں ہی مصروف رہیں۔(البداية والنهاية:۱۰/۳۱۳) اس نے ذمیوں(اقلیتوں) کو حکم دیا کہ وہ اپنے لباس،پگڑی اور دیگر علامات کے لحاظ سے مسلمانوں سے علیحدہ تشخص اپنائیں۔(البداية والنهاية:۱۰/۳۱۵) (۲۳۶ھ) میں اس نے حکم دیا کہ حسین بن علی رضی اللہ عنہما کے مزار اور اس کے گرد جو عمارتیں بنائی گئی ہیں انہیں مسمار کردیا جائے اس جگہ کی زیارت کرنے سے لوگوں کو منع کیا ان عمارات کو ختم کرکے وہاں کھیت بنالیے جہاں لوگ فصلیں اگاتے تھے۔(البداية والنهاية:۱۰/۳۱۵)اس نے امام احمد بن

حنبل رحمہ اللہ کی بہت زیادہ تعظیم کرنے کا حکم دیا۔(البداية والنهاية: ۳۳۸/۱۰) اور محمد بن عبدالملک بن زیات کو قتل کرا دیا جس نے احمد بن نصر رحمہ اللہ کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کو تکالیف دی تھیں اور احمد بن نصر کی لاش کو دفن کرنے کا حکم دیا جو اس وقت سے لٹکی ہوئی تھی جب اسے واثق نے قتل کرایا تھا۔اس طرح وہ دور اختتام کو پہنچا جس میں معتزلہ نے عروج حاصل کیا تھا اور لوگوں پر زبردستی اپنے نظریات نافذ کرنے کی کوشش کی تھی یہ دور مکمل چودہ سالوں پر محیط تھا۔

(چوتھا مرحلہ) بویہیین کے دور میں معتزلہ

بنو بویہ کی حکومت (۳۳۴ھ) میں قائم ہوئی یہ ایران کے علاقوں میں بنی تھی اس حکومت کی بنیاد علی بن بویہ اور بحر قزوین کے جنوب میں رہنے والے اس کے دیلمی بھائیوں نے رکھی تھی اور شیعہ مبلغ حسن بن علی اطروش کے ہاتھوں ان میں خود ساختہ اسلام پھیلا۔انہوں نے رافضی مذہب کو رواج دیا یہ ایک رافضی حکومت تھی مگر بظاہر عباسی خلافت کے نام سے چلائی جا رہی تھی اس کے بھی کچھ سیاسی فوائد تھے اس لیے اس دور میں رافضیہ اور معتزلہ کے درمیان تعلقات سامنے آئے مگر ان تعلقات کی بنیاد بہت پہلے پڑ چکی تھی ابوعلی الجبائی (۳۰۳ھ) جسے المرتضٰی نے معتزلہ کے طبقہ ثامنہ میں شمار کیا ہے نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ردّ میں کتاب لکھی جس میں عباد کی کتاب کی تردید کی تھی جبکہ اسکافی کی کتاب سے چشم پوشی کر لی تھی جس کا نام ''المعیار والموازنۃ'' تھا یہ علی رضی اللہ عنہ کی ابوبکر رضی اللہ عنہ پر فضیلت ثابت کرنے کیلئے لکھی گئی تھی۔(المنية والأمل لابن المترضى: ۱۷۳)

اسکافی معتزلہ کے اکابر میں سے تھا۔اس نے جبائی سے بہت پہلے یہ کتاب لکھی تھی ہم یہ بھی ذکر کر چکے ہیں کہ مامون میں شیعیت موجود تھی ثمامہ نے اسے معاویہ رضی اللہ عنہ پر طعن کرنے کیلئے آمادہ کر لیا تھا۔بلکہ شیعہ اور معتزلہ کی کتب سے معلوم ہوتا ہے کہ واصل بن عطاء اور عمرو بن عبید،عبداللہ بن محمد سے دلائل وعلم میں استفادہ کرتے رہے اور عبداللہ بن محمد نے محمد بن الحنفیہ سے اخذ کیا۔(طبقات المعتزلةللقاضى عبدالجبار: ۱۸)

لہٰذا محمد بن الحنفیہ کی طرف اعتزال کی نسبت صحیح نہیں ہے البتہ یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ شیعی اور اعتزال کی فکر نے باہم خیالات کا تبادلہ کیا ہے۔شہرستانی کی روایت بھی اس بات کی تائید کرتی ہے اس نے لکھا ہے زید بن علی بن حسن نے معتزلہ کے سرخیل واصل بن عطاء کی شاگردی اختیار کی تھی اور اس کے سارے ساتھی معتزلہ بن گئے تھے۔(الملل والنحل، شهرستانى: ۱۵۵/۲)

معتزلہ،رافضہ اور بویہیین کے درمیان رابطے کا سب سے واضح ثبوت یہ ہے کہ معتزلہ کے سرکردہ عالم قاضی عبدالجبار بویہی حکومت میں رئی کا قاضی تھا (۳۶۰ھ) اس کا تقرر بویہی حکومت کے اہم وزیر صاحب بن عباد نے کیا تھا۔ابن المرتضٰی رافضی معتزلی کہتے ہیں کہ قاضی جبار معتزلہ کا ایسا سرکردہ عالم تھا کہ وہ غیر متنازعہ شیخ تسلیم کیا گیا۔(المنية والأمل لابن المترضى: ۱۹٤)

اسی قاضی جبار کے بارے میں صاحب بن عباد کہتا تھا کہ قاضی جبار روئے زمین پر سب سے بہتر آدمی ہے۔(المنية والأمل لابن المترضى: ۱۱)

صاحب بن عباد خود رافضی معتزلی تھا۔(سیر اعلام النبلاء: ۵۱۲/۱٦) مقریزی کہتے ہیں: معتزلی مذہب عراق،خراسان اور ماوراء النہر میں بویہی حکومت کی سرپرستی میں پھیلا ہے۔ابن المرتضٰی نے معتزلہ کے طبقات میں متعدد رافضی معتزلی افراد کا تذکرہ کیا ہے ان میں شریف مرتضٰی جسے بارہویں طبقہ میں شمار کیا ہے۔(المنية والأمل لابن المترضى: ۱۹۸)

ان کے بارے میں امام ذہبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ ذہین آدمی تھا علم کلام،اعتزال،ادب شعر میں بہت ماہر تھا مگر خالص امامی تھا۔(سیر اعلام النبلاء: ۵۸۹/۱۷)

اسی طرح گیارہویں طبقہ میں ابوعبداللہ داعی شمار کیا ہے اس کے بارے میں یحیی بن محمد العلوی کہتے ہیں کہ یہ امامی تھا۔(المنية والأمل لابن المترضى: ۱۹۵،۱۹٦)

اسی وجہ سے دوبارہ جو عروج معتزلہ کو ملا وہ روافض کا مرہون منت تھا اور بویہی رافضی حکومتکے زیر سایہ انہیں حاصل ہوا۔

(پانچواں مرحلہ) معتزلہ کا باقاعدہ ایک فرقہ کی صورت میں سامنے آنا

جب سے روافض اور معتزلہ میں امتزاج سامنے آیا ہے اعتزال کی علامات تشیع میں نظر آنے لگی ہیں رافضہ نے اعتزالی فکر کو بڑی مضبوطی سے تھام رکھا ہے۔صفات وقدر کے مسائل میں انہوں نے معتزلہ کے مذہب کو اپنایا ہے۔اسی طرح عقل کے دائرہ کو وسیع کرنے،اسے اہمیت دینے میں رافضیت نے اعتزال سے مدد لی ہے حالانکہ رافضیت کا مذہب غیر معقول مسائل پر مبنی ہے جیسا کہ امام غائب کا عقیدہ جس کی واپسی کا یہ ہر رات انتظار کرتے ہیں اعتزال نے رافضیت کو اس لیے قبول کیا تا کہ ان

کی حکومت کی سرپرستی میں اپنے مذہب کو پروان چڑھا سکیں جب رافضی دورِ حکومت میں اعتزال نے رافضیت کو اپنے اندر قبول کرلیا تب معتزلہ باقاعدہ ایک فرقہ کی صورت میں اپنی الگ شناخت قائم کرسکا اسی طرح معتزلہ اشعریہ کے منہج کے درمیان بھی زندہ رہا اگرچہ اشعریہ اور معتزلہ کا آپس میں اختلاف ہے مگر ان کا طریقہ بحث اور منہج فکر ایک جیسا ہے اس سے بھی اب تک اعتزالی کلامِ منہج کو فائدہ ہوتا رہا ہے۔ دورِ جدید میں ایک گروہ اٹھا ہے جو اس فکر کو پھر سے زندہ کررہا ہے اس نے اپنا زہر مذہب سنت میں داخل کرنا شروع کردیا ہے جیسا کہ محمد عبدہ کا مدرسہ۔ اور جس طرح موجودہ دور کے بہت سے محققین کے مباحث میں یہ نظریہ پھیل رہا ہے اس کا تذکرہ ہم کتاب کے اختتامیہ میں کریں گے۔ ان شاء اللہ۔

دورِ جدید کے معتزلہ

فکر معتزلہ یا اعتزال کی ہمارے اس دور میں ایک نئی صورت سامنے آئی ہے سابقہ صفحات میں ہم نے معتزلہ کے افکار اور روافض و اشعریوں سے ان کے ارتباط کی جو تفصیل پیش کی ہے اس سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ جب ہم اشعریہ یا روافض کا رد کریں گے تو اعتزال کا رد خود ہی ہوتا جائے گا اور ایسا ہوتا بھی رہا ہے مگر جب کافی مدت گذر جانے کے بعد ایک مرتبہ پھر کچھ لوگوں نے معتزلہ کے سرکردہ افراد کی تعریفیں شروع کردیں اور ان کے نظریات کا پھر سے پرچار، ان کی تحریروں، ان کی عقلیت پسندی کی مدح سرائی، ان کی فاسد آراء کو پھر سے پھیلانا شروع کردیا اور اسلامی توحیدی فکر میں ایک بار پھر یہ زہر گھولنا چاہا ہے۔ کہتے ہیں کیا معتزلہ مسلمان نہیں؟ کیا ہم ان کے علم سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے؟ ہمیں کیا ضرورت ہے کہ ہم مجمد فقہاء اور محدثین کی آراء سے چمٹے رہیں ان کے طریقہ کو اپنائیں اور معتزلہ کے علم سے استفادہ نہ کریں جو کہ ہمارے موجودہ دور سے مکمل طور پر مطابقت رکھتا ہے!؟ یہ صرف ان کا مبہم دعویٰ ہے، صرف ایک رائے ہے جس کے ذریعے سے یہ مسلمانوں کا عقیدہ خراب کرنا چاہتے ہیں کتاب اللہ پر متفق کرنے کے نام پر یہ حق و باطل کو باہم خلط کرنا چاہتے ہیں جبکہ ان کی کوششیں حق و شریعت کو اپنے راستہ سے ہٹانے کیلئے ہیں ہر زمانے کے مفسدین یہی طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ اس کی کونپلیں اسلامی ممالک میں ظاہر ہوگئی ہیں جبکہ ان کے تین بنیادی اصول جو صہیونیوں نے ایجاد کئے ہیں وہ فرانس کے انقلاب کے دوران سامنے آگئے تھے جس کا اصل مقصد انسانی اخلاق کو زوال کی طرف لیجانا اور خالص یہودی معاشرے کو قائم کرنا تھا اس کیلئے مندرجہ ذیل تین اصول انہوں نے شائع کیے۔

❶ **آزادی**

❷ **مساوات**

❸ **عدل**

آزادی: سے مراد ان کی یہ ہے کہ انسان ہر قسم کے دینی، مذہبی اور معاشرتی اقدار کی قید سے آزاد ہو انسانی اخلاق و اقدار کو ترک کرکے خالص بہیمیت اپنائے۔ اگر آزادی سے مراد سیاسی و فکری آزادی ہو تو اسلام کبھی بھی ایسی آزادی میں رکاوٹ نہیں ڈالتا شرط یہ ہے کہ شریعت کے دائرہ کے اندر یہ آزادی ہو۔

مساوات: اس سے مراد یہ لیتے ہیں کہ کسی مسلمان، نصرانی، مجوسی وغیرہ میں کوئی فرق نہ ہو صرف انسانیت کے ناطے یہ بھائی بھائی ہیں عقیدے کی بنیاد پر ان میں کوئی تفریق نہیں ہے۔ اس طرح مساوات کے نام پر تمام ادیان ساقط کردیئے گئے۔ انسانوں کو صرف انسانیت کے نام پر متحد کریں گے اللہ کا فرمان ہے:

وَلَنْ تَرْضٰی عَنْکَ الْیَھُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَھُمْ (البقرۃ:۱۲۰)

یہود و نصاریٰ اس وقت تک تجھ سے راضی نہ ہوں گے جب تک تو ان کی ملت کی تابعداری نہ کرے۔

وَدُّوْا مَاعَنِتُّمْ قَدْبَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاھِھِمْ وَمَاتُخْفِیْ صُدُوْرُھُمْ اَکْبَرُ.

یہ چاہتے ہیں (اے مسلمانو!) کہ تم تکلیف میں مبتلا ہوجاؤ ان کے منہ سے نفرت ظاہر ہوچکی ہے اور جو کچھ یہ دل میں چھپائے ہوئے ہیں وہ بہت بڑا ہے۔ (آل عمران:۱۱۸)

اس طرح کے مشرکوں کے ساتھ اتحاد کیونکر ممکن ہے؟۔

عدل: دولت و جائیداد کی ملکیت مالکوں کے ہاتھوں سے چھین کر یہودی قبضہ گروپ (ملٹی نیشنل کمپنیوں) کے ہاتھوں میں دینا۔ دعوی یہ کرنا کہ دولت کی منصفانہ تقسیم

ہو۔اشتراکیت،قومیت ،سرمایہ داری (سوشلزم،کمیونزم ،کیپٹل ازم) یہ سب دراصل یہودی ذہنیت کی پیداوار ہے اور اس کے اہداف ومقاصد ہیں۔صہیونیت ویہودیت کے ان افکار کو پھیلانے کیلئے مالیاتی ادارے پوری دنیا میں سرگرم عمل ہیں اسی طرح ملٹی نیشنل کمپنیاں بھی ان کی مددگار ومعاون ہیں ان کا مقصد یہ ہے کہ پوری دنیا کی دولت اور وسائل کو لوٹ کر یہودیوں کے قدموں میں ڈال دیے جائیں اس مقصد کیلئے التحرر اور العقلانیہ جیسی تنظیمیں سرگرم عمل ہیں (ہوسکتا ہے کہ پہلے زمانے میں جب مصنف کتاب لکھ رہے تھے اس طرح کی تنظیمیں ہوں اب مختلف ناموں سے این جی اوز کام کر رہی ہیں جن کے اغراض وہی ہیں جو التحرر یا العقلانیہ کے تھے ۔مترجم)ان کی کوشش یہ تھی کہ اسلامی ممالک کو تعلیم کے شعبہ میں مغربی ممالک کے قریب لایا جائے اس طرح انہوں نے اسلامی ممالک کے طلبہ کو غیر مسلم ممالک میں پڑھنے کیلئے ترغیبات ومراعات دیں اور اسلامی ممالک میں بے باک نظام تعلیم رائج کرنے کی ترغیب دی۔مسلمان مصنفین میں سے کچھ نے ارادۃً یا بغیر ارادے کے اپنی کتب میں وہ کچھ نقل کرلیا جو یورپ کی کتب میں موجود تھا جیسا کہ رفاعہ الطھطاوی،خیرالدین تونسی وغیرہ مصنفین ہیں پھر ان کے بعد جمال الدین اسدآبادآیا جو افغانی کے نام سے مشہور ہے جو ایران میں پیدا ہوا اور بڑے بڑے رافضی علماء سے علم حاصل کیا۔(اسلام والحضارۃالغربیۃ محمد محمد حسین ا،ودعوت جمال الدین افغانی فی المیزان، مصطفیٰ غزالی:۳۸۰)

اس نے متعدد ایسے اقدامات کیے جن کے اسلامی ممالک میں بہت برے اثرات ظاہر ہوئے اگرچہ بعض محترم قسم کے مسلمان افغانی کو مشرق کا جگانے والا کہتے ہیں مگر یہ مشرق کو جگانے والا سب سے پہلا بنیاد رکھنے والا بنا جس نے مخلوط وبے باک تعلیم کا پرچار کیا اور یہ بے باکی واختلاط اعلیٰ طبقات میں رائج کیا۔محمد محمد حسین کہتے ہیں: ہم اس مخلوط معاشرے کے علمبرداروں میں سے ایک مصنف کی کتاب میں واضح اشارے دیکھ رہے ہیں کہ یہ خالص عالمی صہیونی دعوت ہے جمال الدین افغانی اس کا ایک اہم چمکتا ستارہ ہے اور محمد عبدہ چراغ محفل ہے۔(اتجاھات الوطنیۃ،محمد محمد حسین:۱/۳۳۹)

احمد امین نے اپنی کتاب ''زعماء الاصلاح'' میں جمال الدین افغانی کے بارے میں لکھا ہے کہ:ان لوگوں کے بارے میں مجھے جس چیز نے سب سے زیادہ (تحقیق) کا شوق دلایا وہ بہت بڑا خطرناک عنوان تھا یعنی آزادی، مساوات، بھائی چارہ، کہ ان کا فائدہ انسانیت کو پہنچے گا!!(زعماء الاصلاح:۷۳)

اس جمال الدین کی حقیقت ترکی علماء نے واضح کردی ہے جنہوں نے اس کی رافضیت اور خبث باطن کو بیان کردیا اور اس کے افکار کو اپنے شہروں سے نکال باہر کیا اس پر کفر کے فتوے لگائے، دولت عثمانیہ کے اس وقت کے مفتی شیخ مصطفیٰ صبری نے ان پر کفر کا فتویٰ لگایا تھا ان کے علاوہ دیگر علماء نے بھی یہی فتویٰ دیا تھا۔

(دعوت جمال الدین افغانی فی المیزان:۱۲)

جمال الدین کے بارے میں مزید تفصیل کی ضرورت نہیں ہے صرف اتنا ہی کافی ہے جتنا کہ استاد محمد عبدہ نے لکھا ہے جس نے مدرسہ عقلیہ اعتزالیہ بنایا تھا جو مدرسہ اصلاحیہ کے نام سے مشہور تھا!اور اس مدرسہ سے بہت سے مصنفین ایسے پیدا ہوئے جو دین میں مداخلت کے الزام سے متہم ہوئے مثلاً طٰہٰ حسین جس نے جاہلی اشعار پر ایک کتاب لکھی اس میں واضح کفر درج تھا اس لیے مصر میں اس کے خلاف فیصلے ہوئے اور جامعہ سے اسے معزول کردیا گیا۔

پھر خلافت عثمانیہ کے زوال کے بعد اعتزال،آزادی،عقلی اصطلاحات کے پردوں میں ایسی کتب تصنیف ہوتی رہیں جو امت مسلمہ کے جسم میں زہریلے تیروں کی طرح پیوست ہوتی رہیں خلافت عثمانیہ اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ کا ایک ذریعہ تھا جب وہ نہ رہا تو مصر میں طٰہٰ حسین کی کتابیں منظر پرآئیں جن میں شعر جاہلی سے متعلق کتاب تھی اور ''التقالید الشرقیہ''،اسی طرح قاسم امین کی کتاب ''تحریر المرءۃ'' ان لوگوں نے دراصل آزادی،ترقی اور عقلیت پسندی کے نام پر اعتزال ومعتزلہ کی مدح سرائی کی اور موجودہ دور میں ان کو مسلمانوں کیلئے بہترین قابل اتباع افراد وافکار قرار دیا۔

احمد امین نے اپنی کتاب ''ضحیٰ الاسلام'' میں سوال جواب کے ذریعے سے یہی باتیں ذہنوں میں بٹھانے کی کوشش کی ہے لکھتے ہیں:ہمیں حق ہے کہ ہم یہ سوال کریں کہ کیا مسلمانوں کی بہتری اس میں ہے کہ اعتزال کا خاتمہ ہوا اور محدثین کے مذہب کو ہی رائج کیا جائے؟(ضحی الاسلام:۳/۲۰۲)

پھر خود ہی جواب دیتے ہیں کہ یہ مسلمانوں کے فائدے میں نہیں ہے کہ اعتزال کا خاتمہ ہو بلکہ اعتزال اور محدثین کا مذہب دونوں ساتھ ساتھ موجود رہنے چاہئیں ان میں مقابلہ جاری رہنا چاہیے کہ کبھی ایک آگے بڑھے کبھی دوسرا، دونوں مذہب ایک دوسرے کی حفاظت کریں تاکہ مسلمانوں کو دونوں سے استفادہ کا موقع ملتا رہے۔(ضحی الاسلام:۳/۲۰۳)

حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے ثابت ہے کہ ایک ہی جماعت ہوگی جو حق پر ہوگی وہی فرقہ ناجیہ اور طائفہ منصورہ ہوگا دیگر بہتر (۷۲) فرقے گمراہ

ہوں گے۔

احمد امین ایک جگہ وضاحت سے کہتا ہے کہ مسلمانوں کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ مذہب اعتزال ختم ہوا۔(ضحی الاسلام:۳/۲۰۷)

احمد امین کی اعتزال کے بارے میں یہ رائے کوئی ایسی نہیں ہے جس کا یہ اکیلا پرچارک ہے بلکہ موجودہ دور میں بہت سے مصنفین اس رائے کے حامل ہیں۔ایک مصنف زکی نجیب محمود ہے اس نے ایک منطقی وضعی نظریہ بنایا ہے اسے دین کی طرح اپنایا ہے (اس نے عالم الغیب ہونے کا انکار کیا ہے وہ کہتا ہے کہ جو کچھ ہم محسوس کر سکتے ہیں، دیکھ سکتے ہیں اور تجربہ میں لا سکتے ہیں یہی کچھ ہے۔عالم غیب صرف احساس وشعور کا نام ہے یہ بھی ایک بدترین صورت ہے الحاد کی کہ مکمل طور پر غیب کا انکار کر دیا ہے اگر چہ صراحتاً الحاد کا اقرار نہ بھی ہو) وہ کہتا ہے کہ اگر ہمارے لیے ممکن ہو کہ ہم اپنی اسلامی میراث میں سے کچھ دوبارہ زندہ کرسکیں تو وہ ہے اعتزال۔وہ اپنی کتاب ’’تجدید الفکر العربی‘‘ میں لکھتا ہے: راقم کے خیال میں موودہ دور میں اسلامی افکار مناہج وطرق کو کامیابی سے جاری رکھنے کیلئے جو جماعت بہت ہی اہم اور ضروری ہے وہ ہے جماعت معتزلہ اس لیے کہ جب بھی (اسلامی معاملات میں) کوئی مشکل آئی ہے اس جماعت نے عقل کی بنیاد پر اس کو حل کیا ہے۔(تجدید الفکر العربی:۱۱۷)

چند صفحات کے بعد لکھتا ہے: میں مسلسل سوچ رہا ہوں اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر ہمارے اس دور کے لوگ اسلاف میں سے کسی کے ہاں فکری ڈور تلاش کرنا چاہتے ہیں تاکہ اسے تھام سکیں اور اسلاف کی میراث سے اپنا تعلق قائم کرسکیں تو اسلاف میں سے جماعت معتزلہ ہی ہے جن کے افکار مشکلات سے نجات کا ذریعہ ہیں۔

(تجدید الفکر العربی:۱۲۳)

یہ بے چارہ اس غلط سوچ میں اس لیے مبتلا ہو چکا ہے کہ یہ زندگی بھر مغربی تعلیم حاصل کرتا رہا ہے مغربی افکار کا مطالعہ کرتا رہا ہے (جیسا کہ اپنی کتاب کے مقدمہ میں خود لکھتا ہے) صرف سرسری طور پر اسلامی افکار کے بارے میں مستشرقین کی کتب کا مطالعہ کرتا رہا ہے وہ بھی مؤمن کی نظر سے نہیں، مستشرق کی نظر سے۔اس کی غلطی اس کا یہ اعتقاد ہے کہ اہل سنت والجماعت ہمیشہ سے عقلی علوم اور اس کے ذریعے سے مسائل کے حل کی راہ میں گھات لگا کر بیٹھے ہوتے تھے اور عقلی آزادی پر پہرے لگا رکھے تھے۔حالانکہ ایسا کبھی نہیں ہوا ہے۔بلکہ تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ اہل سنت اور گمراہ فرقوں میں تنازع اس بات پر رہا ہے کہ یہ فرقے عقل کو غیبی امور میں بھی داخل کرتے تھے اور اللہ ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت شدہ احکام میں بھی اپنی عقل کو داخل کرنے سے نہیں چوکتے تھے حالانکہ اللہ ان سے زیادہ بہتر انسانی مسائل کو جانتا ہے اور انہیں بہتر طور پر حل کرسکتا ہے۔جہاں تک طبعی امور اور تجرباتی معاملات ہیں تو یہ لوگ کوئی ایک مثال بھی ایسی پیش نہیں کر سکتے کہ اہل سنت نے ان میں عقل کے دخل سے منع کیا ہو۔فلاسفہ سے اہل سنت کا جھگڑا اس بات پر تھا کہ انہوں نے علوم غیبی میں اپنی عقلوں کو داخل کیا تو واضح کفر کے مرتکب ہوگئے ورنہ ابن سینا اور فارابی نے جو طبّی کتابیں لکھی ہیں مثلاً ابن سینا کی ’’القانون‘‘ اس پر اہل سنت نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور جب یہ لوگ علوم غیبی میں عقول کو دخل دیتے ہیں تو پھر ان کے دعوے باطل ہوتے ہیں اس لیے کہ اسلام نے اجتماعی، اقتصادی اور معاشرتی جو حل پیش کیے ہیں ان فلاسفہ کے حل اس سے متصادم ہوتے ہیں لہٰذا ان کے اعتزالی فیصلے شریعت کے احکام پر تو مقدم نہیں کئے جاسکتے نہ ہی ان کے افکار کو ربانی نہج پر فوقیت دی جاسکتی ہے۔

معتزلہ کے افکار موجودہ دور کے کچھ محققین کی تصنیفات میں بھی جابجا بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ان کی تعریفیں کرتے رہتے ہیں مثلاً عرفان عبدالحمید اپنی کتاب ’’دراسات فی الفرق والعقائد الاسلامیة:۱۲۵‘‘ میں عنوان باندھتے ہیں: ((اهمية المعتزلة فی الفكر الاسلامی)) اس عنوان کے تحت لکھتے ہیں: معتزلہ پہلا کلامی مدرسہ ہے جو اسلام میں نمودار ہوا ہے اس کا بہت بڑا کردار رہا ہے دینی وفلسفی فکر کو پروان چڑھانے میں یہی وہ فرقہ ہے جس نے اسلامی عقیدہ کیلئے عقلی اصول وضع کیے اور فکر اسلامی میں عقلی نزاع کیلئے ایک مقام متعین کردیا اور حقیقت تک رسائی کیلئے عقل اور اس کے احکام کو بلند مقام دیدیا۔چونکہ ہم عقل کے بارے میں اہل سنت کا موقف پیش کر چکے ہیں اس لیے عرفان کی اس بات پر مزید تبصرہ کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔یہ لوگ صرف مستشرقین کے اقوال ہو بہو نقل کر لیتے ہیں اور اسلام کا موقف جاننے کی کوشش نہیں کرتے جبھی تو عرفان لکھتا ہے: معتزلہ وہ پہلا فرقہ ہے جس نے اسلامی احکام اور عقلی حقائق میں باہم تعلق پیدا کیا اور وہ (بھی بہت بڑی فکری قوت اور عظیم مضبوطی کے ساتھ) بریکٹ میں قول ہم نے سوزانا کا نقل کیا ہے تاکہ عرفان محمود جیسے لوگوں اور مستشرقین کے اقوال کی مماثلت سامنے آسکے۔

عبدالستار راوی اپنی کتاب ’’فلسفۃ العقل‘‘ کے مقدمہ میں لکھتا ہے: (اعتزالی تحریک) ایک ثقافتی تحریک تھی جس نے مغلق مذہبی مسائل کو آزادانہ کلامی جدلیات کے ذریعے حل کیا اور سلف کے بانجھ نظریات کے برعکس منطقی دلائل پیش کرکے مسائل کو قابل بھروسہ حل دیئے۔(فلسفة العقل للراوی:۵)

سلف کے قابل بھروسہ مسائل سے مراد ہے کہ اہل سنت کے مسائل پر عقلی دلائل دیدیئے جس سے ان کی قطعیت ثابت ہوگئی۔(فلسفة العقل للراوی:۵)

پھر اپنے اس بیان کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: (امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے معتزلہ کا جو مقابلہ کیا اس کے بارے میں) کہ احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے کس طرح مشکلات کو برداشت کر کے بھی نصوص ثابتہ کو نہیں چھوڑا) جب احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا معتزلہ نے عقلی دلائل سے محاصرہ کیا تو امام صاحب نے اپنی عقل کی عاجزی کا اقرار کیا کہ میں کلامیین کی جدلیات کا رد نہیں کر سکتا اور صفات کے مسئلہ میں کہا کہ میں نہیں جانتا صرف اتنا کہوں گا کہ جو کچھ اللہ نے اپنے بارے میں کہا ہے وہی صحیح ہے۔

(فلسفة العقل للراوی:٥)

ہم امام صاحب کیلئے اللہ سے دعا ہی کرتے ہیں اور ان کو شاباش دیتے ہیں ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ بارہ صدیوں کے بعد جا کر ایک شخص کو معلوم ہوا ہے کہ امام کا موقف کیا تھا اور جو لوگ دین کو کھیل بنا رہے تھے ان کے مقابلے پر امام کے پاس کیا نص شرعی تھی؟ اگر ہم تفصیل سے وہ کچھ بیان کرنا شروع کر دیں جو جدید دور کے مصنفین نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے تو بات بہت طویل ہو جائے گی ہم صرف اسی پر اکتفا کرتے ہیں جواب تک لکھ لیا ہے تا کہ یہ دلیل ہو کہ ہم نے یہ جو تحریر کا بیڑہ اٹھایا ہے کہ ہم معتزلہ کے گمراہ کن نظریات اور اس کے مقابلہ میں صحیح مذہب کے دلائل پیش کریں یہ ہم نے صحیح کہا ہے اور یہ لوگ جو عقل، آزادی اور ترقی کے نام پر جو کچھ لکھ رہے ہیں وہ اسلام کے صاف منہج سے بہت دور ہے۔

ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے دور کے بعض اچھے خاصے علماء نے جو کہ خود کو اسلامی تحریکوں سے وابستہ قرار دیتے ہیں نے اس مسئلے پر مکمل توجہ نہیں دی بلکہ بعض نے تو تعریفی کلمات تک ان کے حق میں ادا کیے ہیں مثلاً ڈاکٹر عدنان زرزور نیجا کم جشمی اور اس کا تفسیری منہج کے موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے اس میں ابوزہرہ حفظہ اللہ کے معتزلہ کی تعریف میں کہے ہوئے یہ الفاظ درج ہیں ابوزہرہ کہتے ہیں: معتزلہ اسلامی فلسفی کہلانے کے بجا طور پر مستحق ہیں اس لیے کہ انہوں نے اسلامی عقائد عقلی طور پر سمجھائے ہیں اور خود کو اسلامی حقائق تک مقید و محصور رکھا ہے اس سے باہر نہیں گئے ہیں یہ لوگ قرآن کو فلسفی فہم کے ساتھ سمجھتے ہیں اور حقائق کی فہم میں گہرائی تک جاتے ہیں مگر شریعت اور نصوص سے باہر نہیں نکلتے (نصوص سے نکلنا یہ بھی ہے کہ انہیں چھوڑ دیا جائے مگر یہ بھی تو ہے کہ ان کی غلط تاویل کی جائے جیسا کہ معتزلہ اور شیعہ وغیرہ نے کیا ہے) اسی طرح محمد ابوزہرہ حفظہ اللہ معتزلہ کے عقلی منہج کے فوائد بھی بیان کرتے ہیں کہ اسلام کے دفاع اور اس کے حقائق کو سمجھنے اور مخالفین کو سمجھانے کیلئے اور اسلام سے بے خبر لوگوں کو اسلام سے آگاہ کرنے کیلئے معتزلہ کا عقلی طریقہ اچھا ہے (کیا معتزلہ کے منہج میں اسلام کے دفاع کا کچھ حق ہے!؟) پھر ڈاکٹر عدنان دعویٰ کرتے ہیں جس میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت شدہ منطوق نصوص کی مخالفت کرتے ہیں جیسا کہ تہتر (٧٣) فرقوں والی حدیث جو کہ مسلم میں ہے۔ کہتا ہے کہ اسلامی تاریخ میں ایسا کوئی فرقہ نہیں ہے جو اکیلا ہی صحیح اسلامی عقیدہ پر کاربند ہونے کا دعویٰ کرے اور اس کے مخالفین بدعتی، گمراہ، خواہشات کے پیرو ہوں اور کوئی بھی فرقہ کسی ایک جانب انتہائی غلو میں نہیں جا سکتا اور ہماری یہ ذمہ داری بھی نہیں کہ ہم ایک فرقے کے مقابلے میں دوسرے فرقے کی حمایت ونصرت کریں۔ اس بات میں تین غلطیاں ہیں:

❶ یہ کہ کوئی ایسا فرقہ نہیں ہے جو مکمل طور پر اسلامی عقیدے پر کاربند ہونے کا دعویٰ کرے۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو پھر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کا کیا بنے گا جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ہمیشہ ایک گروہ حق پر رہے گا۔ (مسلم)

اور وہ اسلامی جماعت وگروہ کہاں ہے جس کے ائمہ میں مالک، شافعی، ابوحنیفہ، احمد بن حنبل، ابن تیمیہ، ابن قیم، ابن کثیر اور محمد بن عبدالوہاب رحمہم اللہ وغیرہ بہت سے ایسے ہیں جن کے عقائد متفقہ ہیں اگرچہ فروعی مسائل میں اختلافات ہیں اور کیا عقیدہ اسلامیہ اتنا مشکل ہے کہ ان صدیوں میں کوئی جماعت اسے مکمل طور پر اپنا نہ سکی؟ دوسری بات یہ کہ اس نے سرے سے اس بات کا انکار کر دیا ہے کہ کوئی بدعتی، گمراہ اور خواہشات کے پیروکار بھی ہوں گے اگر ایسا ہے تو پھر ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اہل الاہواء کی پیروی سے منع کیوں کیا ہے؟ یہ فیصلہ ہم مسلمان قاری پر چھوڑ دیتے ہیں۔

❷ دوسری غلطی یہ کی ہے کہتا ہے: کہ کوئی بھی فرقہ افراط یا تفریط کی آخری حد تک نہیں جاتا ہم کہتے ہیں کہ اہل سنت ہی وہ واحد گروہ ہے جو افراط وتفریط سے پاک ہے جیسا کہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے کہا تھا کہ اہل سنت ہی ہیں جو اللہ کے افعال کے بارے میں درمیانہ راستہ اختیار کیے ہوئے ہیں ورنہ ایک طرف معتزلہ ہیں جو قدر کے منکر ہیں، جبریہ ہیں جو اللہ کی حکمت کے منکر ہیں، اس کی رحمت وعدل کا انکار کرتے ہیں، وعد اور وعید کے باب میں وعیدیہ ہیں جو نافرمان مسلمانوں کو ہمیشہ کا جہنمی قرار دیتے ہیں، ایک مرجئہ ہیں جو بعض وعیدوں کا انکار کرتے ہیں۔ اہل سنت ہی افراط وتفریط سے محفوظ وسطی طریقہ پر ہیں۔ ورنہ بعض فرقے تو اتنے غلو میں ہیں کہ کسی کو خدا قرار دیتے ہیں، بعض اتنے تفریط میں ہیں کہ امت کے بہترین لوگوں تک کو کافر کہہ دیتے ہیں۔ (ابن تیمیہ رحمہ اللہ الجواب الصحیح:١/٨)

❸ تیسری غلطی کہتا ہے: کہ ہم پر کسی ایک گروہ کی نصرت ذمہ داری نہیں ہے۔ہم کہتے ہیں کہ ہماری زندگی کا تو بنیادی مقصد ہی یہ ہے کہ ہم باطل فرقوں کی کجی ظاہر کریں اور ہم پر فرض ہے کہ ہم باطل فرقوں اور الحادو کفر کے مقابلے پر کھڑے ہوں۔عمل وہی مقبول ہوتا ہے جو خالص لوجہ اللہ کیا جائے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر کیا جائے۔تمام فرقوں کو ایک جیسا سمجھنا یا ایک بنانا یہ صحابہ کرام اور سلف صالحین کے عقیدے کو معیوب قرار دینا ہے۔

جدید مدرسہ ''اصلاحیّہ''

ماضی سے متعلق کتابیں پڑھنے والوں کیلئے ممکن ہے کہ وہ ایسے مدرسے کے آثار معلوم کرلیں جو فکری لحاظ سے دیگر سے ممتاز تھا اور اس کی طرف اکثر مصنفین خود کو منسوب کرتے ہیں تا کہ اس سے استدلال کیا جاسکے ان مصنفین کی آراء کی وحدت پر،ان کے مفاہیم میں مشابہت اور ان کے مقاصد کی یکسانیت کا پتہ لگایا جاسکے یہ مدرسہ اگر چہ باقاعدہ ایک عمارت نہیں رکھتا مگر قاری اندازہ لگا سکتا ہے کہ یہ ایک جیسے افکار کے حاملین اسی مدرسہ کے پڑھے ہوئے ہیں۔

مثلاً: سید احمد خان ہندی اور جمال الدین اسد آبادی اور محمد عبدہ، یہ ایک اعتزالی مذہب کو زندہ کرنے اور شریعت کو اس کی روشنی میں اپنانے کی تحریک ہے۔اور عقل کو اس فیصلے کا بھی اختیار دیا جاتا ہے جو اس کے دائرہ اختیار میں نہیں ہے۔اس مدرسہ کے افکار کو اگر ایک نام دیا جاسکتا ہے تو وہ ہے ماڈرن ازم یعنی شریعت کے اصول وفروع میں تغیر وتبدل اور انہیں عقل کے اس منہج کے مطابق ڈھالنا جو جدید یورپ نے وضع کیا ہو یا اس مذہب کے ارباب عقل نے وضع کیا ہو وہ ارباب عقل جو اس منہج غربی کے شاگرد ہیں اس ماڈرن ازم سے شریعت کا کوئی بھی اصولی یا فروعی مسئلہ محفوظ نہیں ہے چاہے اصول فقہ ہوں ،حدیث ہو،تفسیر ،فقہی مسائل،حجاب،طلاق،تعدد زوجات،حدود یا ادیان میں تقارب کا مسئلہ ہو،اس مدرسہ کے سرخیل سید احمد خان ہیں جنہیں ''سر'' کا خطاب برطانوی حکومت نے بطور عزت واحترام دیا تھا۔سید کا خیال ہے کہ قرآن احکام شریعت کیلئے واحد اور اکیلا ماخذ ومصدر ہے اور احادیث چونکہ بعد میں مدون ہوئی ہیں لہٰذا وہ اس قابل نہیں ہیں دوسری بات یہ ہے کہ زیادہ تر احادیث خبر آحاد ہیں جو علم یقین کا فائدہ نہیں دیتیں۔اسی لیے وہ ربا کو تجارت میں حلال اور رجم کی سزا کو غلط قرار دیتے ہیں اور دین کی نشرواشاعت کیلئے جہاد کی مشروعیّت کی نفی کرتے ہیں۔

سید احمد خان کے شاگرد سید امیر علی مسلمان عورت کی اہل کتاب مرد سے شادی حلال وجائز قرار دیتے ہیں اسی طرح عورت مرد کا باہمی رضامندی سے بلا نکاح باہم میل ملاپ بھی جائز قرار دیتے ہیں۔

محمد اسد (جو کہ دراصل لیوبولڈ فانیس) غیر مسلم تھا ۱۹۲۶ء میں جب یہ سعودی عرب میں ملازم تھا اس وقت مسلمان ہوا کہتا ہے: کہ اللہ کی صرف سلبی صفات ہی بیان کی جاسکتی ہیں یہی بات معتزلہ نے کی تھی۔(مفہوم تجدید الدین:۱۵۱) انکار معجزات میں یہ محمد عبدہ کے نقش قدم پر چل رہے ہیں اصحاب الفیل کا کنکر کے ذریعے سے جو کہ پرندے لائے تھے ہلاکت کا انکار کرتے ہیں۔

اسی طبقہ میں ایک محمد فتحی عثمان بھی ہیں وہ بھی اپنی کتاب ''الفکر الاسلامی والتطور'' میں عقیدہ اور شریعت دونوں کو ماڈرن بنانے کی دعوت دیتے ہیں۔

اس سے آگے بڑھ کر ڈاکٹر حسن ترابی کہتے ہیں کہ اصول فقہ کی تجدید ہونی چاہیے وہ لکھتے ہیں: ہمارے موجودہ دور میں اسلامی احکام بہت بڑے عقلی اجتہاد کا تقاضا کر رہے ہیں اور عقل میں اتنی صلاحیت ہے جس کا کوئی انکار نہیں کرسکتا۔جس اجتہاد کی ہمیں ضرورت ہے وہ صرف فروعی مسائل میں اجتہاد نہیں ہے بلکہ اصول میں بھی ہونا چاہیے۔

محمد سعاد جلال کہتے ہیں کہ شریعت سے نص کے ذریعے سے جو دلیل وثبوت ہو اس میں شک کا امکان رہتا ہے یہاں تک کہ قرآن میں بھی اور جو بھی بطور نقل ہم تک پہنچا ہے! گمان اس میں دلالت کے ذریعے سے ہی داخل ہوتا ہے۔

محمد عبداللطیف غزالی دعویٰ کرتے ہیں کہ سلف کے تمام علمی ورثہ کو ترک کر دیا جائے سلف کے علوم بہت پیچھے رہ گئے ہیں اب ہمارے پاس یورپ کے علوم ہیں!

(مفهوم تجديد الدين:۴۹)

فقہ کے مسئلہ میں حجاب کے متعلق فتحی عثمان کہتے ہیں: جب مرد وعورت کئی مقامات پر ملتے ہیں اور پرسکون واطمینان کی حالت میں تو ملاقات کسی بھی ناخوشگوار یا شدید واقع کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔اگر مرد وعورت کو عام ملنے جلنے کی اجازت دی جائے تو مرد وعورت ایک دوسرے سے مانوس ہوں گے مرد، عورت کے اور عورت، مرد کے معاملات

،مشکلات ومسائل سے باخبر ہوں گے اس طرح عورت دینی ،اخلاقی ،بچوں کی تربیت ،خاندان کی بہتری کے معاملات جان لے گی ایک دوسرے کے تجربات ومعلومات سے استفادہ کرسکیں گے اور پھر یہ جو شاذ ونادر واقعات ہوتے ہیں یہ نہیں ہوں گے ۔عورت مرد کے آزادانہ ملاپ کا یورپ کا چند سالہ تجربہ گویا عورت کے تجربات یا معلومات میں اضافہ کرے گا اور اس کی حفاظت میں معاون بنے گا؟ جبکہ اللہ علیم وخبیر کو نعوذ باللہ یہ معلوم نہ تھا کہ عورت کی معلومات وحفاظت کا کیا طریقہ ہونا چاہیے۔ ؟عبداللطیف غزالی کہتا ہے: ہم اب اس بارے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے کہ آدمی پر چار شادیوں اور طلاق کے معاملے میں کچھ پابندیاں وقیود لگادیں۔

(الدعوۃ الی التجدید،لعصام البشیر:٦٠)

حسن ترابی حدود کے بارے میں کہتے ہیں:فکری طور پر مرتد ہونا جبکہ حکومت کے خلاف بغاوت نہ ہو تو اس کے ارتداد کیلئے حد قائم نہیں کیا جاتا اعتقادی کفر یا شرعی تعبیر کو فکری ارتداد کہتے ہیں۔

محمد فتحی عثمان کی رائے ہے ارتداد کی حد فوجی نقطۂ نظر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کی تھی۔

ادیان مختلفہ میں قربت پیدا کرنے کے بارے میں عبدالعزیز کامل کہتے ہیں:مشرق وسطیٰ اپنے تین ادیان اسلام ،یہودیت ،عیسائیت کے ساتھ توحید کا علاقہ ہے اس بات کی تائید فہمی ہویدی اور محمد سعید عشماوی نے بھی کی ہے۔(جریدۃ الأخبار المصریۃ:١٧/١٠/١٩٧٩)

عبداللہ الغزالی اسلام کے معنی کی تشریح اس طرح کرتے ہیں:مسلمان وہ ہے جو اللہ کو تسلیم کرے اور اچھائی کرنے والا ہو چاہے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لائے یا یہودی ہو یا عیسائی ہو یا صابئین میں سے ہو۔کہتا ہے کہ جنت صرف مسلمان موحدین کیلئے محدود نہیں ہے اللہ کے ہاں صرف اسلام ہی واحد نجات دینے والا دین نہیں ہے ۔ہر دین والے یہ عقیدہ کیوں رکھتے ہیں کہ صرف ہم ہی جنت میں جائیں گے اور بقیہ جہنم میں؟ پھر کہتا ہے کہ شرک کا معنی ہے ادیان میں باہمی دشمنی!

(نظرات فی الدین:١٦،٢٤)

ہر مسلمان کو ان باطل دعوتوں سے احتراز واجتناب کرنا چاہیے ۔اگرچہ کتنے ہی خوبصورت وخوشنما ناموں کے ساتھ سامنے آئیں کتنا ہی اسلام کا نام استعمال کریں جدیدیت ،عقل پسندی یا رواداری کا نام اپنائیں یہ سب گمراہی اور دین سے انحراف کا سبب ہیں۔

اختتامیہ

یہ تھا فرقہ معتزلہ اپنے ماضی وحال کے آئینہ میں اپنے افکار واعتقادات اور اپنے منہج کی روشنی میں ۔اگر ہم چاہتے ہیں کہ ان فریب ومکر سے پر ناموں سے اپنے نوجوانوں کو بچائیں تو ہمیں چاہیے کہ ہم انہیں بتائیں کہ یہ کلامی منہج جو اعتزال نے اختیار کیا ہے یہ صرف نظری مباحث ہیں جن کا عمل سے دور کا بھی واسطہ نہیں اسی لیے یہ صرف دنیا وآخرت کے خسران کا ہی سبب ہیں ۔دنیا وآخرت کی کامیابی کیلئے وہ عملی راستہ اختیار کرنا چاہیے جو اللہ علیم وخبیر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی بہت ہی آسان طریقے سے سمجھایا ہے جو انسان کو عقیدہ آفاقی وارضی دلائل ومشاہدات سے سمجھاتا ہے اسے نظری ابحاث میں نہیں الجھاتا جبکہ ان کے مذہب کے داعی مسلمانوں کو عمل سے دور کرکے صرف نظری مباحث میں مشغول رکھنا چاہتے ہیں تاکہ ان کی زرخیز زمینوں پر قبضہ اور باصلاحیت افراد کو اپنا تابع بناسکیں ۔یورپ کے بڑے بڑے ماہرین کئی سال قبل یہ جان چکے ہیں کہ ان نظری مباحث کا کوئی فائدہ نہیں سوائے کمزوری کے۔ان نظریات پر ترقی کی بنیاد کا دعویٰ صرف طفل تسلی ہے لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے اللہ نے ہمیں جو منہج وطریقہ عطا فرمایا ہے اس پر عمل پیرا ہو کر ہم مشرق ومغرب میں کامیابیاں اور اخروی سرفرازیاں حاصل کرسکتے ہیں۔

ہم ان معتزلہ اور نظری مباحث میں الجھنے والجھانے والوں سے سوال کرتے ہیں کہ دنیا کے کس ملک میں ان نظریات پر کوئی حکومت قائم ہے اور کامیاب ہے؟ جبکہ ہم بتاسکتے ہیں کہ ٢٣ سال کے مختصر عرصہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آسان عقیدے اور احکام پر مبنی بہترین حکومت قائم کی تھی ۔اگر ان نظریات پر بہتر حکومت قائم کی جاسکتی ہوتی تو مامون رشید کی ہوتی۔

امام مالک رحمہ اللہ نے کتنی اچھی بات کی تھی کہ میں وہ بات ناپسند کرتا ہوں جس پر عمل نہ ہوسکتا ہو۔

(سیر اعلام النبلاء:٨/٨٨،مذاھب الاسلامیین لبدوی:١/٣٠)

اور کہا تھا کہ کیا جب ہمارے پاس کوئی عقلمند آدمی آئے گا تو ہم اس کے کہنے سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت کو چھوڑ دیں گے؟(ایسا نہیں ہوسکتا)

(أبو زید القیروانی،الجامع:١٥٩-٢)

اور کہا تھا کہ میں ناپسند کرتا ہوں کہ کوئی خود کو ابراہیم علیہ السلام یا آدم علیہ السلام کی طرف منسوب کرے (اور عملی زندگی چھوڑ کر فقط نسبتوں کو ذریعہ نجات سمجھے)۔امام اوزاعی رحمہ اللہ کہتے ہیں مجھے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ جب اللہ کسی قوم کے ساتھ برائی کا ارادہ کرتا ہے تو انہیں نظری مباحث میں الجھا دیتا ہے اور عمل سے روک دیتا ہے۔(سیر اعلام النبلاء للذهبي:١٦/١٠٤)

یہ ان ائمہ اسلام کی احتیاط تھی کہ انہوں نے علم کلام میں مشغول ہونے سے منع کیا جیسا کہ امام شافعی رحمہ اللہ اور احمد بن حنبل رحمہ اللہ وغیرہ ہیں۔اس لیے انہیں معلوم تھا کہ یہ مباحث مسلمانوں کو بے عملی کی طرف لیجائیں گے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ترقی کی یہی وجہ تھی کہ وہ بے فائدہ باتوں سے اجتناب کرتے تھے۔نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ ''یہ امت اس وقت تک متحد رہے گی جب تک قدر اور ولد (مشرکین کی فوت شدہ نابالغ اولاد کے متعلق جھگڑنا کہ جنتی ہیں یا جہنمی؟) ان میں بحث نہ کرے گی۔''

(قال الذهبي:حديث صحيح رواه ابن حبان وصححه الحاكم)

ڈاکٹر کسیس ماہر انسانیات یورپی دانشور کہتا ہے:جب بھی نظری مذہب جسے عقل نے ایجاد کیا ہے ظاہر ہوا ہے تو وہ جزوی نظریات سے آگے نہیں بڑھا۔کوئی ایسا فلسفی مذہب نہیں ہے جو تمام لوگوں کو قبول ہوا ہو اور انسانی زندگی کے مسائل کا حل اس نے پیش کیا ہو ان مذاہب میں صرف فرضی باتیں ہوتی ہیں جن کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا، نہ عملیت سے تعلق ہوتا ہے۔لہٰذا ہمیں چاہیے کہ زندگی کے مسائل زندگی کے تجربات سے حاصل کریں۔

(انكسيس كاريل،تأملات في سلوك الانسان:٤٧)

مزید کہتا ہے:علم کیلئے ممکن ہے کہ وہ ہماری زندگی کی الجھنیں سلجھا دے مگر جو نظری فلسفی نتائج اٹھارویں صدی ہجری میں سامنے آئے انہیں ہم بے کار سمجھتے ہیں۔(انكسيس كاريل،تأملات في سلوك الانسان:٩،٧)

ان نظریات نے انسان کو سستی و کاہلی میں مبتلا کیا ہے یہ صرف معانی میں ہی الجھے رہتے ہیں تجربہ، استدلال سے زیادہ تلخ و شدید ہوتا ہے اس لیے انسان ہمیشہ اس تجریدی کھیل کی طرف ہی زیادہ مائل ہوتا ہے۔پھر کہتا ہے جب فلسفہ کا دور شباب تھا اس وقت فلاسفہ نے آزادی کے چاہنے والوں کو یورپ و امریکہ کی اندھی تقلید کا مشورہ دیا عقل کے نام پر وہ صرف تقلید ہی کرتے رہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے نظریات ہمارے اسلاف کے پسندیدہ نظریات کے سامنے ٹھہر نہ سکے۔

(انكسيس كاريل،تأملات في سلوك الانسان:١)

سبحان اللہ! کس طرح زمانہ اپنی چال چلتا ہے کس طرح ہمارے دور کے فلسفی و علماء بھی تین صدیوں سے یورپ کی پیروی میں مصروف ہیں اور ہمیں آزادی یا آزاد خیالی کا درس دے رہے ہیں جیسا کہ یورپ میں ہو رہا ہے یہ طوطے کی رٹے رٹائے الفاظ ہی ادا کر رہے ہیں جیسا کہ ان کے اسلاف کرتے تھے۔پھر کاریل کہتا ہے :مذاہب نظریہ کی تاکید ہی تہذیب کی تباہی کا سبب بنا۔(انكسيس كاريل،تأملات في سلوك الانسان:١١)

اگر کاریل اس کی گواہی نہ بھی دیتا تو ہم ایک گواہی مستشرق ہاملتون کی کافی سمجھتے وہ کہتا ہے:جب عربی فکر افراد کی فکر میں مرتکز ہوگئی تو مسلمان علماء اسکندری (فلاسفہ) سے بھی زیادہ تعمق و گہرائی میں چلے گئے اسلام کے بارے میں تحقیق کرنے والے صرف سابقہ معلومات پر اکتفا کرنے لگے بلکہ وسطیٰ صدیوں میں یورپ کی جو معلومات حاصل ہوئی تھیں انہی کو تحقیقات کا مصدر و ماخذ بنا لیا(الا تجاهات الحديثة في الاسلام،هاملتون جب:٣٣)

افسوس کی بات ہے کیا ہمارے فلاسفہ کو یہ بھی معلوم نہ ہو سکا جو اس ہاملتون کو معلوم ہوا۔ہم ان دو گواہیوں پر ہی اکتفا کرتے ہیں کہ یہ ان کے ہم خیال یا ہم مذہب لوگوں میں سے اہم ترین علماء کی گواہیاں ہیں کہ غربی تہذیب اسلام کے نظریات و مناہج میں ہلاک کر دینے والی آفات ہیں۔مسلمانوں کو ان کے بے فائدہ نظریات کو اپنانے کے بجائے ان کے ٹیکنالوجی سے استفادہ حاصل کرنا چاہیے اور اس کا علم حاصل کرنا چاہیے ہم مسلمانوں کو یہی مخلصانہ مشورہ دے سکتے ہیں کہ یورپ سے صرف دنیاوی معلومات حاصل کریں اور دینی معلومات کیلئے اہل سنت والجماعت کے صحیح منہج کو اپنائیں جو ہر قسم کے افراط و تفریط سے پاک ہے۔حق و باطل میں کشمکش جاری رہتی ہے جب تک کہ باطل مٹ نہ جائے اور حق ظاہر نہ ہو جائے جب بھی حق سامنے آئے تو وہ لیے جانے کا حقدار ہے۔ہم چاہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی واضح شریعت مسلمانوں کے سامنے رہے وہ اسی کو اپنائیں اسی پر چلتے رہیں اور دیگر مسترد شدہ کام سے جو صرف لفظی اور جدلی مباحث ہیں محفوظ رہیں۔

اللہ سے دعا ہے کہ وہ مسلمانوں کو صاف اور سیدھی راہ پر قائم رکھے اور باطل فرقوں کی طرف سے اٹھائی جانے والی دھند کو صاف کر دے۔وہی دعائیں سننے اور قبول کرنے والا ہے۔(آمین!)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مضامین

فصل اول

فصل دوم

تیسری فصل